راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 21واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

MONTHLY
ARXANG
LAHORE

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

مئی ۲۰۲۰ء

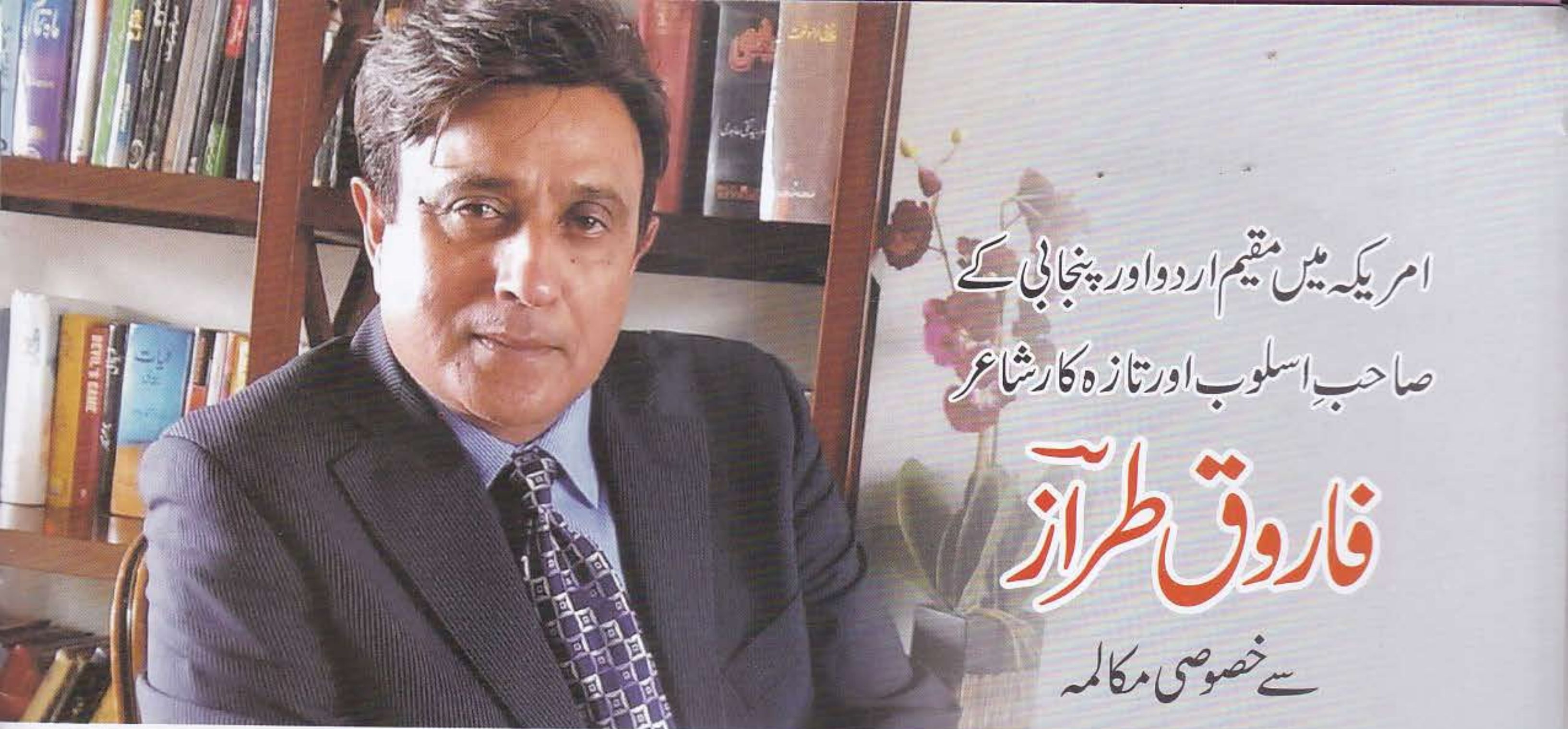

امریکہ میں مقیم اردو اور پنجابی کے

صاحبِ اسلوب اور تازہ کار شاعر

فاروق طرازؔ

سے خصوصی مکالمہ

شعر گوئی میں تمام عمر خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہا: فاروق طرازؔ

میری خوش قسمتی کہ برکلے یونیورسٹی سان فرانسسکو کی آغوش میں پلا بڑھا۔ ارژنگ کے قارئین کے لیے عامر بن علی سے گفتگو

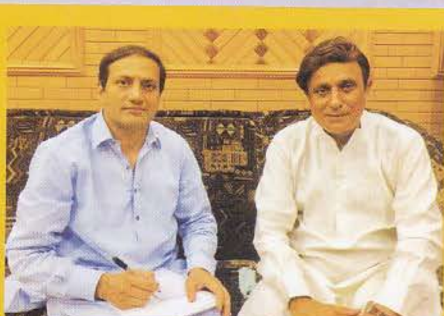

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات فاروق طراز اور ان کی منفرد شاعری سے بخوبی واقف ہیں۔ خوبصورت شعر کہنے کے ساتھ ساتھ وہ ان چند خوش بخت تارکینِ وطن میں شامل ہیں جنہوں نے تمام زندگی پاکستانی زبانوں کی دیارِ غیر میں ترویج اور اپنے ادب کو عالمی سطح پر روشناس کروانے کی کوششوں میں صرف کی ہے۔ مقبول شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کامیاب کاروباری شخصیت بھی ہیں۔ میں تو اسے خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ کرونا وائرس کے عالمی پھیلاؤ کے دنوں میں وہ کیلی فورنیا کی بجائے پاکستان میں ہیں۔ اتفاق سے راقم بھی ان دنوں پاک سرزمین کی کشورِ حسین یعنی میاں چنوں میں ہے۔ اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کورونا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فاروق طراز کو ارژنگ کے قارئین کے لیے انٹرویو کی گزارش کی، جو انہوں نے شاید اس لیے مسترد نہیں کی، چونکہ ہم دونوں کی جائے پیدائش ایک ہی گاؤں ایک ہی گلی میں واقع ہوئی ہے۔

ارژنگ: آپ کی پیدائش تو میاں چنوں میں ہوئی، اپنے بچپن اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتایئے؟

فاروق طراز: ابتدائی تعلیم میاں چنوں میں ہی مکمل کی۔ کالج سے گریجوایشن کرنے کے بعد میں امریکہ چلا گیا۔ یہ سن 1980ء کی دہائی تھی جب میں پاکستان سے جا کر امریکہ میں بس گیا۔

ارژنگ: شعر گوئی کی جانب کیسے راغب ہوئے؟

فاروق طراز: ہمارے گھر کے عقب میں اردو اور پنجابی کے معروف شاعر سالک ربانی رہائش پذیر تھے۔ بچپن سے اُن کے ساتھ نیازمندی کا تعلق تھا۔ چونکہ سالک ربانی صاحب کو اردو، پنجابی اور عربی کے علاوہ فارسی زبان پر اُستادانہ مہارت و عبور حاصل تھا، ان کے حلقے میں بوٹا انجم اور صدیق ربانی جیسے سخنور شاعر تھے جس کے سبب ایک ادبی ماحول موجود تھا۔ میں نے شروع شروع میں پیروڈی اور مزاحیہ شاعری کی غیر سنجیدہ سی کوشش کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ تم غزل بھی کہہ کر دیکھو۔ چنانچہ ان کے مشورے پر پہلی مرتبہ میں نے غزل کہی۔

مجھے ٹون اپ سالک ربانی صاحب نے کیا، وہ اکثر کئی طرح مصرع دے دیتے تھے کہ اس پر کوئی غزل کہو، اس طرح سے زمانۂ طالب علمی میں وہ میری شعری تربیت کرتے رہے۔ وہاں سے ہی شاعری پڑھنے کا بھی شوق ہوا اور اسی طرح سے یہ سخنوری کا یہ سارا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ارژنگ: امریکہ کیسے جانا ہوا؟ عمر کا ایک بڑا حصہ وہاں گزرا، کیسا تجربہ رہا؟

فاروق طراز: میں اسے ایڈونچر کا شوق ہی کہوں گا۔ حالانکہ پاکستان میں معاشی آسودگی میسر تھی، مگر دوستوں کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا، ویزہ لگوایا اور امریکہ جا پہنچے۔ وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 21 واں سال

Monthly Arxang Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 21 مئی 2020 شمارہ نمبر 5

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ لبنیٰ صفدر ◉ ابرار ندیم

{مجلس مشاورت}

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ • زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹو گرافر • نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس • محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت، سلام / 2

مضامین:

- آئی لو یو سیّد ضمیر جعفری / عطاء الحق قاسمی ، 3
- لالہ و گل.....حمید احمد خاں / شمشاد احمد ، 5
- میں کیوں لکھتا ہوں؟ / جمیل یوسف ، 9
- تخلیق کے زاویے / ڈاکٹر مختار عزمی ، 11
- مہاجر پرندے.....ہجرت کا شعری استعارہ/نوید مرزا ، 17
- میرا گریباں چاک / ظفر احمد چودھری ، 18
- قولِ فیصل کے بارے میں/ ڈاکٹر اختر شمار، ڈاکٹر طاہر شہیر ، 20
- Beyong Beat/آغا گل ، 21
- ممنوعہ چہرے / محمد طارق علی ، 25
- صحرا میں پکار / شائستہ مفتی ، 31

شعری گوشے:

- عاصم ثقلین درانی ، ڈاکٹر جاوید باتش 33 تا 34

شاعری 35

سفرنامے

- امریکیات / فقیر اللہ خاں ، 37
- دُنیا میری نظر میں / عامر بن علی ، 39

کالم

- خط و کتابت / ڈاکٹر سیّد سلیمان عبداللہ ڈار ، 40

آپ بیتی

- ڈپٹی کمشنر کی ڈائری / رئیس عباس زیدی ، 43
- انٹرویو: فاروق طراز ، 49
- انٹرویو: خالد یزدانی ، 51

شاعری 53

- کورونا۔خطرناک ترین وبا / لبنیٰ صفدر ، 54
- کورونا۔ہوگئے گھر میں مقیّد ، 55

خطوط ، 56

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد

اشک ہیں اور کرن ہے صاحب جی
آپ کی انجمن ہے صاحب جی
قتل کرنے میں اور ہونے میں
کس قدر بانکپن ہے صاحب جی
ہم تو دوزخ کو بھرنے والے نہیں
یہ ہمارا وچن ہے صاحب جی
جتنے دلکش نظارے ہیں اُن میں
اچھی خاصی گھٹن ہے صاحب جی
کچھ تو سچ مچ ہے میری مجبوری
کچھ مرا بھولپن ہے صاحب جی
پتے یونہی دھمال میں کب ہیں
پورے سُر میں پون ہے صاحب جی
حمد میں دل کی بات کر لینا
اپنا طرزِ سخن ہے صاحب جی

حسن عباسی/لاہور

یہ زمیں تیری آسماں ترے
میں بھی تیرا ہوں سب جہان ترے
تو مرا رب ہے میرا پروردگار
نعمتوں کا نہیں ہے کوئی شمار
میرا حمد و ثنا سے واسطہ ہے
ذکر صلِ علیٰ سے واسطہ ہے
رحم کی ہے دعا کرم کی ہے
اے خدا التجا کرم کی ہے
جو ہیں بیمار ان کو صحت دے
جو ہیں تکلیف میں تو راحت دے
شر سے ابلیس کے حفاظت کر
میں گنہ گار ہوں رعایت کر
فضل تیرا ہو بے تحاشا ہو
رزقِ پاکیزہ میں اضافہ ہو
دل فقط تیری یاد سے آباد
میری پوری ہو مولا ہر فریاد
زندہ رکھ مولا دین کی شاں پر
موت دینا تو دینا ایماں پر

عدیل احمد آسی/ڈنمارک

نعت

مساء و صبح درودوں کے مشغلے رہیں گے
ہر آن زیست میں آقاؐ کے تذکرے رہیں گے
رہے گا سلسلہ یونہی رواں اُجالوں کا
رواں مدینے کی گلیوں کو قافلے رہیں گے
یہ برگ و گل ہیں کسی گلشنِ حضوری کے
اسی لیے یہ ہمیشہ ہرے بھرے رہیں گے
شرف انہیں بھی عطا ہوگا مستجابی کا
درِ حبیبؐ پہ جو لفظ اَن کہے رہیں گے
سما گئی جو محبت حضوؐر کی دل میں
یہ ظلمتیں نہ کہیں تیرہ شب کدے رہیں گے
قدم اُٹھا کے ذرا دیکھ کوئے احمدؐ پر
یہ خارزار نہ پاؤں کے آبلے رہیں گے
دیارِ احمد مرسل ہے یہ، یہاں جعفر
خبر سے دور خرابوں کے سلسلے رہیں گے

جعفر حسن مبارک/فیصل آباد

صحرا کو ملک، ملک کو اعلیٰ تریں بنا دیا
ایسا کرم نگاہ کا، پتھر نگیں بنا دیا
جتنا بھی رزق تھا اُسے زیر زمیں سنبھال کر
جتنی زمین تھی اسے سب کی زمیں بنا دیا
انؐ کے عجب جمال ہیں، انؐ کے عجب کمال ہیں
جتنی جہاں طلب ہوئی، اُتنا وہیں بنا دیا
پہلے ملائی آپؐ نے، خاک میں نور کی ضیاء
سجدے سے پھر جبین کو، زہرہ جبیں بنا دیا
جتنے بھی معجزات ہیں پر ہے یہ معجزہ الگ
لات و منات کی جگہ، رب کو یقیں بنا دیا
حسنِ نبیؐ پہ فخر کو دیکھا تو پھر حضور نے
شانِ بلالؓ کو وہیں سب سے حسیں بنا دیا
اوّل بنا دیا گیا ناصر علی کو معتدل
گنبد سبز سبز پھر دل میں کہیں بنا دیا

ناصر علی/لاہور

آپؐ کی ذات سب سے اعلیٰ ہے
آپؐ کی بات سب سے اعلیٰ ہے
جو بھی گزری ہے صحن طیبہ میں
وہ ہر اک رات سب سے اعلیٰ ہے
جو برستی ہے انؐ کی رحمت کی
وہ ہی برسات سب سے اعلیٰ ہے
جو ملی ہے حضوؐر کے در سے
بس وہ خیرات سب سے اعلیٰ ہے
کتنی اصناف ہیں سخن میں مگر
سب ہی میں نعت سب سے اعلیٰ ہے
جو غزالی حضوؐر سے پائی
وہی خیرات سب سے اعلیٰ ہے

غزالی/گوجرہ

آئی لو یو سیّد ضمیر جعفری

عطاء الحق قاسمی/لاہور

راولاکوٹ میں ایک تقریب تھی جس میں برادرم کبیر خاں نے مجھے اور سید ضمیر جعفری کو مدعو کیا تھا، ہمیں راولاکوٹ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک نہایت خوبصورت مقام بنجوسہ کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا جو چاروں طرف سے بلند و بالا اور سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اس کے درمیان میں ایک صاف شفاف جھیل تھی، میں اور سید ضمیر جعفری اس روح پرور ماحول میں واقع ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئے تو ہمارا پہلا سامنا اس ریسٹ ہاؤس کے اٹینڈینٹ سے ہوا جس کے متعلق ہمیں علم نہیں تھا کہ وہ ہکلا ہے بلکہ بہت ہی ہکلا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے اس کا نام پوچھا تو وہ اپنا نام بتانے کی کوشش میں مصروف ہوگیا، میں نے اسے اس مشکل سے نکالنے کے لئے دوسرا سوال کیا جس کا جواب وہ صرف سر کی جنبش سے دے سکتا تھا، میں نے پوچھا ''یہاں نہانے کو گرم پانی مل جائے گا؟'' اس پر مجھے اس کے ہونٹ ہلتے محسوس ہوئے کچھ دیر بعد وہ بولا ''ن ن ن نور محمد'' یہ میرے پہلے سوال کا جواب تھا جو اس کی طرف سے مجھے موصول ہوا تھا چنانچہ اس کے بعد دو دن میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

اصل واقعہ جو میں آپ کو بتانے چلا ہوں، وہ بنجوسہ ریسٹ ہاؤس میں قیام کے اگلے روز کا ہے .... صبح صبح میں اور ضمیر صاحب بغیر ناشتہ کئے چہل قدمی کے لئے ریسٹ ہاؤس سے نکلے، ارادہ تھا کہ پانچ دس منٹ بعد واپس آجائیں گے، چنانچہ میں نے رات والی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی جواب ''وٹو وٹ'' ہو چکی تھی پاؤں میں ہوائی چپل تھی، ضمیر صاحب نے دھوتی باندھی ہوئی تھی اور ان کے پاؤں میں بھی ہوائی چپل تھی، ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک راہگیر نے ضمیر صاحب کو پہچان لیا، اس نے آگے بڑھ کر عقیدت سے بھرپور مصافحہ کیا، پھر ضمیر صاحب کے ہاتھ چومے اور پھر سامنے والے پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ''اس پہاڑ کی چوٹی پر سے مقبوضہ کشمیر نظر آتا ہے''، ضمیر صاحب یہ سن کر تڑپ اٹھے، کشمیر کے ساتھ ان کی جو جذباتی وابستگی تھی، وہ انہیں اس تصور سے بے چین کئے جا رہی تھی کہ پہاڑ کے دوسری طرف وادیٔ کشمیر ہے جہاں پا بجولاں کشمیری اپنے کسی نجات دہندہ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ راہ گیر نے ضمیر صاحب کی بے چینی دیکھی تو بولا ''آئیں چوٹی پر سے آپ کو آپ کے کشمیر کا نظارا کراتے ہیں''، ضمیر صاحب فوراً تیار ہوگئے، میں نے انہیں روکا اور کہا کہ چوٹی بہت بلندی پر ہے، اس لیے آپ کی عمر اور آپ کے تن و توش کے شایانِ شان نہیں، لہٰذا اس ایڈونچر کا خیال دل سے نکال دیں مگر جہاں وادیٔ کشمیر چند قدم پر نظر آ رہی ہو، وہاں ضمیر صاحب نے بھلا کسی کی سننا تھی، چنانچہ ہم نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا، رستے میں کانٹے دار جھاڑیاں تھیں جن سے ضمیر صاحب کی دھوتی قدم قدم پر الجھنے کی کوشش کرتی تھی، مور اوور یہ کہ پگڈنڈی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، پہاڑ پر یوں چڑھنا پڑ رہا تھا جیسے چوٹی سر کر رہے ہوں، نتیجہ یہ کہ تھوڑی دیر بعد ضمیر صاحب نے بہت بری طرح ہانپنا شروع کر دیا، ان کی زبان باہر کو نکل آئی اور سانس دھونکنی کی طرح چلنا شروع ہوگئی۔ اتنے میں ایک شخص جو پہاڑ پر سے لکڑیاں چن کر واپس آ رہا تھا، اس نے قریب سے گزرتے ہوئے روٹین میں ''السلام علیکم'' کہا....... ضمیر صاحب نے مجھے مخاطب کیا اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولے ''قاسمی........ صاحب .... اسے.......... میری طرف...... سے........ وعلیکم السلام کہہ دیں!''

سید ضمیر جعفری کے حوالے سے یہ ایک چھوٹا سا چٹکلہ میں نے آپ کو اس لئے سنایا کہ کشمیر اور پاکستان سے عشق کرنے والے اس شاعر کی عمر اسی طرح بڑے بڑے پہاڑ سر کرتے اور مشکلات کی سختی چٹکلوں سے دور کرتے گزری، میں نے شاعروں میں اگر کوئی سچا صوفی دیکھا ہے تو وہ سید ضمیر جعفری ہی تھے۔ صوفی کی ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی سے نفرت نہیں کرتا، نفرت نہیں کرتا تو پھر ظاہر ہے غیبت بھی نہیں کرتا، وہ نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ پستیوں سے بہت دور ہوتا ہے، میں اور ضمیر جعفری پاکستانی مندوبین کے طور پر حیدرآباد دکن میں منعقدہ عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لئے انڈیا گئے تو ہم دونوں دہلی، حیدرآباد اور بمبئی کے ہوٹلوں میں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے اور یوں میں پندرہ

دن تک چوبیس گھنٹے ان کے ساتھ رہا...... اور انہی پندرہ دنوں میں، میں نے اس سید بادشاہ کو دریافت کیا۔ وہ صبح کی نماز پڑھتے تھے مگر جب کبھی میری آنکھ کھلی میں نے انہیں سجدے میں دیکھا یا التحیات میں بیٹھے دیکھا یا رکوع میں نظر آئے، میں انہیں قیام کی حالت میں دیکھ ہی نہیں سکا کہ انہیں ہاتھ باندھ کر یا ہاتھ کھول کر یا ہاتھ ناف سے اوپر یا ناف سے نیچے بندھا ہوا دیکھ پاتا اور یوں آپ کو بتا سکتا کہ وہ سنی تھے کہ وہ شیعہ تھے، بریلوی تھے کہ اہل حدیث تھے، مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ بھی انہیں صرف بطور مسلمان جانتے ہیں اور ہم میں سے کسی کو بھی علم نہیں کہ وہ کس مسلک کے پیروکار تھے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ جانے وہ کون اور کیسے مسلمان ہیں جو مسلک کے حوالے سے مسلمانوں کا خون بہاتے ہیں اور اس کے عوض جنت کی توقع رکھتے ہیں، اسی طرح ابھی تک میری ملاقات کسی پٹھان، پنجابی، مہاجر، بلوچی یا سندھی سے نہیں ہوئی جو ضمیر صاحب کو جانتا ہو اور ان سے ٹوٹ کر محبت نہ کرتا ہو، اس لئے کہ ضمیر صاحب کی زندگی اور ذہن کی لغت میں انسانوں کو خانوں میں بانٹنے والے پیمانوں کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، ان سے محبت کرنے والوں میں عوام اور خواص دونوں شامل ہیں، سید معین الدین حیدر جب گورنر سندھ تھے۔ انہوں نے میرے سفرنامہ ''دلی دوراست'' میں پڑھا کہ ضمیر صاحب کو پیٹھے کی مٹھائی بہت پسند ہے تو وہ خاص طور پر مٹھائی کا ڈبہ لے کر ان کی طرف پہنچے............ اور جہاں تک کسی کی غیبت کرنے کا تعلق ہے، آپ یقین جانیں، میں نے انڈیا میں جو پندرہ دن ضمیر صاحب کی معیت میں گزارے، میں ان پندرہ دنوں میں غیبت کرنے کے لئے ترس گیا، میں جس کے بارے میں زبان کھولتا، ضمیر صاحب اس کی شخصیت کا کوئی ایسا رخ پیش کرتے کہ میری ساری غیبت دانی دھری کی دھری رہ جاتی........ اس سے پہلے، سچی بات یہ ہے کہ میں ضمیر صاحب کے لوگوں سے تعلقات کو ان کی پبلک ریلیشنگ کے حوالے سے دیکھا کرتا تھا، مگر ان پندرہ دنوں میں مجھ پر کھلا کہ پبلک ریلیشنگ سے تو اس شخص کا دور کا تعلق بھی نہیں ہے، یہ تو دل سے اس بات کا قائل ہے کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کی ارفع و اعلیٰ مخلوق ہے لہٰذا اس سے پیار واجب ہے، اب میں ضمیر صاحب کو کیسے سمجھاتا کہ کچھ انسان اگر اشرف المخلوقات کی ذیل میں آتے ہیں تو کچھ ''اسفل السافلین'' کی منہ بولتی تفسیر بھی ہیں، مگر وہ تو اس سلسلے میں میری سنتے ہی نہیں تھے۔

تاہم جہاں تک چھیڑ چھاڑ اور جملے بازی کا تعلق تھا جو اس کی زد میں آ رہا ہوتا، اسے بچ کر نکلنے نہیں دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک اہل قلم کانفرنس کے موقع پر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے چند لوگوں کی موجودگی میں ضمیر صاحب سے تازہ کلام کی فرمائش کی، ان چند لوگوں میں ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی موجود تھے جن کی انا پہاڑ جتنی تھی، انہیں ناگوار گزرا کہ ان کی موجودگی میں سربراہِ مملکت نے انہیں نظر انداز کر کے کسی دوسرے سے کلام کی فرمائش کیوں کی چنانچہ جب ضمیر صاحب چند شعر سنا چکے تو حفیظ صاحب نے انہیں مخاطب کر کے کہا ''اوئے ضمیر، جب تم میرے ماتحت کام کیا کرتے تھے، اس وقت تو بہت بونگے ہوتے تھے اب بہتر ہو گئے ہو'' ضمیر صاحب نے جواب میں ہاتھ جوڑ کر کہا'' بس حفیظ صاحب، یہ سب آپ سے دوری کا فیض ہے!'' حالانکہ ضمیر صاحب، حفیظ صاحب کی عزت پیروں کی طرح کرتے تھے مگر جملے کو دعوت حفیظ صاحب نے خود دی تھی۔

اسی طرح ایک دفعہ ضمیر صاحب اردو کے ممتاز شاعر عبدالعزیز خالد کے مہمان تھے جو عربی آمیز اردو میں غزل لکھتے ہیں ضمیر صاحب نے کچھ لکھنے کے لئے خالد صاحب سے قلم مانگا مگر دو تین دفعہ کوشش کے باوجود وہ نہ چلا تو ضمیر صاحب نے انہیں قلم واپس کرتے ہوئے کہا'' یہ رکھ لیجئے اسے غالباً آسان اردو لکھنے کی عادت نہیں ہے!''

اور جہاں تک سید ضمیر جعفری کی طنز و مزاح پر مبنی شاعری کا تعلق ہے، میرا ایمان ہے کہ اکبر الٰہ آبادی اور سید ضمیر جعفری طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے دو سنگ میل ہیں مگر میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ دیارِ ادب میں جس شخص سے رونق تھی، وہ شخص ہم میں نہیں رہا، ایسے کتنے لوگ ہیں جو مرنے کے بعد بھی تصور میں آتے ہیں تو مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ آتے ہیں، یہی مسکراتا ہوا چہرہ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے، یہ چہرہ میری آن ہے اور میری محبت ہے۔ آئی لو یو سید ضمیر جعفری!

لالہ وگل......حمید احمد خاں

شمشاد احمد/کراچی

بڑھتی عمر کے ساتھ مستقبل کا روشن کواڑ سر کتا سر کتا، آہستہ آہستہ بند ہونے لگتا ہے تو انسان مجبوراً پیچھے کی طرف لوٹتا ہے...... وہاں ایک وسیع و عریض سمندر اس کا منتظر ہوتا ہے...... وہ اس سمندر پر جمی کائی کو ہٹا ہٹا کر اُن موتیوں کو چننے لگتا ہے جو زندگی کی دوڑ میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

گرمیوں کی طویل چھٹیوں کے بعد کالج کھل گئے تھے...... کلاسیں شروع ہو گئی تھیں۔ ''بزمِ ادب'' کے نئے گروپ تشکیل پا چکے تھے...... نوٹس بورڈ پر طلباء اور اُن کے انچارج اساتذہ کے نام لگا دیے گئے تھے۔

جمعرات کے دن، ہدایات کے مطابق، ہم لوگ اپنے گروپ کے لیے مخصوص کمرے میں جمع تھے۔

کھسر پھسر ہو رہی تھی...... سینئر طلبا پیش پیش تھے۔

''ہمارے انچارج حمید احمد خاں ہیں۔ وہ ''زمیندار'' اخبار والے مولانا ظفر علی خاں کے بھائی ہیں...... ولایت سے پڑھ کر آئے ہیں۔''

ہم مولانا ظفر علی خاں کی عظمت و شہرت سے آشنا تھے لیکن ولایت کی پڑھائی نے ہمیں زیادہ مرعوب کیا...... ان دنوں ولایت آنا جانا خاصا کم کم تھا۔

اچانک کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ ایک خوش شکل، صاف ستھرے صاحب، ہلکے گہرے رنگ کے سوٹ اور ذرا شوخ سی ٹائی میں ملبوس کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

اُنہوں نے آواز میں ''السلام علیکم'' کہا اور ساتھ ہی اپنے بھاری فریم والے چشمے کے پیچھے سے چمکتی شفاف آنکھوں سے طالب علموں کا جائزہ لینے لگے۔

انہوں نے اپنا تعارف کرایا ''میرا نام حمید احمد خاں ہے۔ میں آپ کے ''بزم ادب گروپ'' کا انچارج ہوں۔''

ہم ان کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ بوٹا سا قد، داڑھی مونچھ صاف...... دھیما، مہذب لہجہ، آواز میں ہلکی سی کھنک...... ہمیں خاں صاحب پہلی نظر میں ہی بھا گئے تھے۔

بزم ادب ایک اچھا آئیڈیا تھا...... تھرڈ، فورتھ، ففتھ اور سکستھ ایئر۔ چاروں کلاسز سے طالب علم لے کر گروپ تشکیل دیا جاتا تھا۔ اس طرح جونیئر اور سینئر طلبا ایک ساتھ مل کر ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ایک دوسرے کے خیالات اور نظریات سے مستفید ہوتے تھے۔ سخن فہمی اور سخن وری کی آب یاری ہوتی تھی۔

پہلی میٹنگ تھی...... خاں صاحب نے مختصراً بزم ادب کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ پھر طالب علموں کو ایک ایک کر کے اسٹیج پر بلانا شروع کیا۔

ہر طالب علم اپنا تعارف کرواتا۔ بیچ میں خاں صاحب سوالات پوچھتے جاتے۔ ان میں اکثریت ایسے طالب علموں کی تھی جو زندگی میں پہلی بار 'اسٹیج' کے ہوّے سے دوچار ہوئے تھے...... ان کی حالت قابل دید تھی۔

اس پہلے دن کی ایک بات میرے ذہن میں اٹک گئی تھی...... آج بھی ویسے ہی اٹکی ہوئی ہے۔ ایک معصوم بچھڑے نما طالب علم نے اپنا نام بتایا۔ ''غلام رسول'' خان صاحب نے اسے گھورا پھر شہادت کی اُنگلی سے چشمہ جمایا۔

''محمدؐ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں، ان کی اطاعت ہمارا دینی فریضہ ہے لیکن یہ لفظ 'غلام' شاید انہیں ہضم ہو کر نہ دے رہا تھا۔

خان صاحب کچھ اُلجھ گئے تھے۔ انہوں نے گفتگو کا رُخ پلٹ دیا اور غلام رسول سے جائے پیدائش اور کچھ دوسری باتیں پوچھنے لگے۔

کچھ عرصہ تک خان صاحب سے ہماری یاد اللہ بزم ادب تک ہی محدود رہی۔ پھر فورتھ ایئر میں ہمیں پراکٹر بنا دیا گیا۔

پراکٹر شپ ایک معقول سلسلہ تھا۔ ہر سیکشن کے لیے ایک پراکٹر ہوا کرتا تھا۔ انچارج ایک سینئر اُستاد ہوتے تھے۔ یہ لوگ کالج کے ہر فنکشن میں بیج لگائے ہر قسم کی اُونچ نیچ پر نظر رکھتے تھے۔ ڈسپلن پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ انہیں پرنسپل صاحب کی آنکھیں اور کان سمجھا جاتا تھا۔

ہمارا شمار اب کالج کے چھوٹے موٹے لیڈروں میں ہونے لگا تھا۔ اس کے باوجود خان صاحب کو دیکھ کر (جو اب پرنسپل ہو چکے تھے) اٹینشن ایک طرف کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگر فاصلہ زیادہ ہوتا تو جلد از جلد ان کی آنکھوں کی رینج سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے۔

اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اُن کے لیے محبت اور احترام کے جذبات کے اُوپر فاصلے کی ایک چادر تنی رہتی تھی۔ بالکل اس دور کے باپ بیٹے کا رشتہ۔

پراکٹوریل میٹنگوں میں انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ وہی نوالہ شہد کا اور آنکھ شیر کی۔

کلاس جاری تھی۔ خان صاحب ارسطو پر لیکچر دے رہے تھے (اب ہم خیر سے ایم اے میں آ چکے تھے) کلاس روم کے متوازی ہرا ابھرا لان تھا۔ کمرے کی نیچی کھڑکیاں لان میں کھلتی تھیں...... تازہ ہوا اور خوشبوئیں...... رابندر ناتھ ٹیگور کی درس گاہ کا منظر تھا۔

اچانک باہر کچھ جوان زندگی سے بھرپور قہقہے گونجے۔ سب باہر جھانکنے لگے...... خان صاحب بولتے بولتے رُک گئے۔

ہم نے بھی باہر جھانکا۔ ہاسٹل کی دیوار سے لگے چار پانچ جونیئر طلبا خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اتفاق سے میں کھڑکی کے بالکل ساتھ بیٹھا تھا۔ خان صاحب نے اشارہ کیا۔ ''ان لوگوں کا کچھ کرو۔''

میں اُٹھا تو پیچھے سے خان صاحب کی آواز آئی ''ذرا شرافت سے......''

میں ایک ہی جست میں کھڑکی پر چڑھا اور چار پانچ فٹ کی بلندی سے باہر کود گیا۔ لڑکوں کو ڈانٹ پلائی۔ وہ گھبرا کر تتر بتر ہو گئے اور میں اسی طرح ایک بار پھر کھڑکی پھلانگ کر واپس اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

خان صاحب خاموش تھے۔ اُن کی مخصوص مسکراہٹ غائب تھی۔ انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں ڈانٹ پلائی۔ وہ گھبرا کر تتر بتر ہو گئے اور میں اس طرح ایک بار پھر کھڑکی پھلانگ کر واپس اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

خان صاحب خاموش تھے۔ اُن کی مخصوص مسکراہٹ غائب تھی۔ اُنہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں ڈانٹ پلائی۔

''محترم شمشاد احمد صاحب۔ اندر باہر، آنے جانے کے لیے ایک مناسب اور باوقار راستہ ہوتا ہے۔''

سب لڑکے مسکرا رہے تھے اور میں...... مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

کلاس ختم ہونے پر میں خان صاحب کے پیچھے ہو لیا۔

''سر! میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

خان صاحب رُک گئے۔ اُن کی مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔

''میں بُدبدا رہا تھا۔''

''سر میں پینڈو ہوں۔ ایک دور افتادہ قصبے، جلالپور جٹاں کا رہنے والا نفاستوں اور سلیقے سے نا آشنا''

خان صاحب نے مجھے تھپکی دی۔

تمہارا پینڈو بڑا اچھا ہے...... اب تم ایک عرصے سے لاہور جیسے شہر میں رہ رہے ہو۔ آئندہ بھی تمہیں شہروں ہی میں رہنا ہوگا...... ذرا اس پینڈو کا تھوڑا سا میک اَپ کر لو۔''

اس واقعے سے میں نے کچھ سکھایا نہیں...... کچھ کہا نہیں سکتا...... میرا پینڈو آج بھی ویسے کا ویسا موجود ہے...... میری بیگم شہر کی ہے۔ میری کسی حرکت پر بلبلائی۔ ''ہونہ وہی جلال پور کے پینڈو''

میں بھی غصے میں آ گیا ''تو مجھے پیرس میں پیدا کروا لیا ہوتا۔''

ہمارے ساتھ ایک صاحب تھے۔ اُن کا نام اقبال تھا۔ وہ ریگولر طالب علم نہ تھے...... پرائیویٹ طالب علموں کو سہولت حاصل تھی کہ وہ کیزول (Casual) اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کلاسز اٹینڈ کر سکتے تھے...... ہم سب کو اقبال سے بے حد دلچسپی تھی۔

کیونکہ وہ اپنی کلاس بلکہ پورے کالج میں واحد شادی شدہ طالب علم تھے...... آدمی کم گو تھے یا پھر جلدی کی شادی نے انہیں کم گو بنا دیا تھا۔ ہم لوگ اکثر اُنہیں گھیر لیتے تھے اور کرید کرید کر اُن سے ازدواجی رموز جاننے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ محبوباؤں کے جھوٹے سچے قصے تو چلتے رہتے تھے لیکن شوہر اور بیوی کے ایک کمرے، ایک بستر کی کہانیاں! آخر ہم سب کو بھی ایک دن اس پھولوں کی سولی پر چڑھنا تھا۔

ایک دن اچانک کالج کے مین گیٹ پر کچھ غیر طالب علمانہ اور غیر مانوس آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہمارے آفس سپرنٹنڈنٹ، قاضی صاحب (سرخ پھندنے والی ٹوپی والے) گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے۔ اُن کی ٹوپی کا پھندنا پاگل ہو رہا تھا۔

''باہر کچھ غنڈے ہمارے ایک طالب علم کو مار رہے ہیں۔''

ہم باہر بھاگے۔ ایک لفنگا اقبال کا کالر پکڑے اس پر مکے برسا رہا تھا اور ساتھ میں منہ بھر بھر کر غلیظ بھاری بھرکم پنجابی گالیاں اُگل رہا تھا۔

اقبال کو چھڑایا گیا۔ اس لفنگے پر مکوں، تھپڑوں کی بارش ہونے لگی۔ کچھ دوسرے طالب علم باقی بدمعاشوں کو قابو کر چکے تھے۔ اُن چوہوں کو وارننگ دے دی گئی کہ اگر آئندہ اقبال کی طرف بری نظر سے دیکھا تو ہم تمہارے گھروں تک پہنچ جائیں گے۔

کسی نے جاننے کی کوشش نہ کی کہ آخر معاملہ کیا تھا!

اندر آئے تو قاضی صاحب کے پھندنے نے لہرا لہرا کر ہم سب کا استقبال کیا۔ پھر انھوں نے چشمہ اُتار کر اپنی بائیں آنکھ دبائی اور خان صاحب کے دفتر کی طرف اشارہ کیا اور ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ خان صاحب کو واقع کی اطلاع مل چکی تھی۔

پہلے تو انھوں نے تھوڑی گرمی کھائی...... لیکن جب انھیں تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس میں قاضی صاحب کی ٹوپی کا پھندنا بھی شامل ہو گیا...... تو خان صاحب ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ اُٹھے اور کمرے کا ایک چکر لگایا۔

''تم اچھا کام بھی برے انداز میں کرتے ہو۔ اپنے دوست کی مدد کرنا اچھی بات ہے لیکن اس طرح سے نہیں!''

سر جھکائے باہر آ گئے...... ابھی برامدے میں ہی تھے کہ قاضی صاحب پھدکتے ہوئے آ گئے۔ ٹھیٹھ پنجابی میں مجھے حوصلہ اور ہمت دی۔

''خاں صاحب تمہیں پسند کرتے ہیں لیکن اُوپر سے ذرا رعب داب بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔'' یہ سچ تھا اور میرے لیے اس کی اہمیت نشانِ حیدر سے کم نہ تھی۔

ایک دن اچانک طلبا کے ایک مخصوص گروپ نے ہڑتال کر دی۔ کالجوں میں ابھی ہڑتالوں کی وبا نہ پھوٹی تھی۔ اگر کسی کو کوئی شکایت ہوتی تھی تو پرنسپل صاحب سے مل کر معاملات خوش اسلوبی سے سلجھائے جاتے تھے۔

ہم پر اکٹروں نے کرتا دھرتا لڑکوں سے بات چیت کی...... لیکن وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے...... انہیں ایک اُستاد سے شکایت تھی۔ موصوف سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا تو اسے اپنی ہتک جان کر گنواروں کی طرح گالی گلوچ پر اُتر آتے تھے۔ سنی سنائی تھی کہ دو ایک بار ہاتھ پاؤں بھی چلا چکے تھے۔ سبھی جانتے تھے ان استاد صاحب کا رویہ یکسر غیر مہذب اور غیر شریفانہ تھا...... لیکن استاد تو استاد ہوا کرتا تھا۔

باغیوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ وہ کلاسوں میں چلے جائیں اور خاں صاحب کے آنے پر انھیں مل لیں۔ کچھ لوگوں کو لیڈری کے میدان میں تازہ تازہ دھکیلا گیا تھا اور جب لیڈری کی بیماری لگ جائے تو پھر اپنا آپ آپے میں نہیں رہتا۔

نعرہ بازی جاری تھی۔ ہمیں شک تھا جو بعد میں سچ ثابت ہوا کہ اس کاروائی کے پیچھے کچھ اساتذہ بھی تھے۔ ان کی ٹیچر موصوف سے ذاتی پرخاش تھی اور وہ درپردہ اس آگ کو پھونکیں مار رہے تھے۔

اس دوران خاں صاحب کی گرین مارس مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ افراتفری دیکھ کر گاڑی قاضی صاحب کے دفتر کے سامنے آ کر رُک گئی۔ خاں صاحب باہر آئے۔ ایک نظر ہنگامہ باز طالبعلموں پر ڈالی۔ جست لگا کر باہر آئے اور برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو گئے۔

انہوں نے داہنا ہاتھ بلند کیا۔ مکمل خاموشی تو نہ ہوئی لیکن مجمع سنبھل سا گیا۔ خاں صاحب نے بڑے اعتماد اور اطمینان سے ہجوم کو مخاطب کیا۔

''میں بے حد شرم سار ہوں۔ میرے طلبہ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔'' انہوں نے مجھ سے ملے بغیر ہڑتال کر دی ہے۔ میں آپ کا پرنسپل ہونے کا اہل نہیں ہوں۔''

خاں صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے دفتر میں چلے گئے۔ ہڑتالیوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ سن کھڑے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ادھر ادھر سرکنے لگے۔ لیڈرانِ کرام ابھی تک جمے ہوئے تھے۔

خاں صاحب اچانک باہر آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک فل اسکیپ کاغذ تھا۔ خاں صاحب نے وہ کاغذ ہوا میں لہرایا۔

''یہ میرا استعفیٰ ہے۔''

وہ مزید کچھ کہنے والے تھے کہ لیڈرِ کرام ان کی طرف لپکے۔ اُن کے ہاتھ جڑے تھے اور وہ معافی معافی کی گردان کر رہے تھے۔

خاں صاحب نیچے اُتر آئے اور انہیں بڑی شفقت سے ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے۔ لڑکوں کی ایک ہی گردان تھی۔

''سر...... آپ استعفیٰ نہیں دیں گے۔ نہیں دیں گے...... نہیں دیں گے۔''

چند لمحوں میں کالج پر سکون ہو گیا۔ کلاسیں معمول کے مطابق چلنے لگیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ خاں صاحب نے اُس اُستاد کو دفتر میں بلا کر دروازے کھڑکیاں بند کر کے رموزِ اُستادی پر ایک طویل لیکچر دیا۔ اس کے بعد طالب علموں کو کوئی شکایت نہ رہی۔ (اندر کی خبریں ہمارے قاضی لیک (Leak) کرتے رہتے تھے۔

(قاضی صاحب اگر حیات ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور لمبی زندگی عطا کرے اور اگر...... تو انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے)

ایم اے کے امتحان سے فراغت پا چکے تھے۔ ہاسٹل کا کمرہ خالی کرنا پڑا۔ میں اپنے ماموں جان کے گھر گڑھی شاہو منتقل ہو گیا۔

زندگی میں پہلی اور تقریباً آخری بار مالی مشکلات کے جن سے واسطہ پڑا۔ اس میں سراسر میری ہی نالائقی تھی۔ جوانی کے بانولے اُونٹ نے خواہ مخواہ محبت کرنے والے باپ سے پنگا لے لیا۔ ہاسٹل کا آخری مہینے کا بل ادا نہ ہو سکا۔ کیشیئر، شفیع صاحب نے بھی اصرار نہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ بل کہیں نہیں جائے گا۔ ادا ہو جائے گا۔

رزلٹ میں ابھی دیر تھی۔ جیب پہلی بار بری طرح سے خالی تھی۔ ایک دوست میرے حال سے واقف تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے والد صاحب سے ملوایا۔ وہ فیروز سنز میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی سفارش سے مجھے فیروز سنز میں ملازمت مل گئی۔ وہاں معروف شاعرہ بسمل صابری بچوں کے سیکشن کی انچارج تھیں۔ اللہ جانے انہیں یاد ہوں یا نہیں۔

کام خاصا دلچسپ لیکن تھکا دینے والا تھا۔ میرے کمرے میں دُنیا بھر کی کیٹالاگز کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ مجھے فہرستوں کو دیکھ کر فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ مارکیٹ کے لحاظ سے کون کون سی کتاب درآمد کرنی چاہیے۔

تنخواہ معقول تھی۔ میرے ذہن میں ہوسٹل کا بل پھڑ پھڑاتا رہتا تھا۔ بار بار سوچتا تھا کہ تنخواہ ملے اور سب سے پہلے اس بوجھ سے نجات ملے۔

میں کمرے میں بیٹھا کام میں محو تھا۔ اچانک نگاہیں اُٹھیں۔ شیشے کے پار خاں صاحب نظر آئے۔ وہ ایک شیلف کے سامنے کھڑے کتابوں کا جائزہ لے رہے تھے۔

میں خوفزدہ اور شرمسار تھا۔ 'خاں صاحب کو

اطلاع مل چکی ہوگی۔

پہلے تو سوچا کہ منہ پھیر کر اپنے آپ کو خاں صاحب کی نظروں سے بچالوں لیکن...... میں جلدی سے باہر آیا۔ ادب سے سلام کیا۔ خاں صاحب کتابوں سے میرے رشتے پر خوش ہوئے۔ ان کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی نہ تھی۔

وہ رخصت ہونے لگے تو میں نے ڈرتے ڈرتے ہوسٹل کے بل کا ذکر کیا۔

''سر...... میں بہت جلد......''

خاں صاحب نے مجھے پُرشفقت ڈانٹ پلائی۔

''ایسی باتیں سرِعام نہیں کرتے۔''

خاں صاحب چلے گئے لیکن میں سوچتا رہا کہ خاں صاحب کیا سوچتے ہوں گے۔

میں نے اپنی نالائقی کا ذکر شوروم کے انچارج آغا صاحب سے کیا۔ آغا صاحب ریٹائرڈ ڈی ایس پی پولیس تھے لیکن کہیں سے بھی پولیس والے نہ لگتے تھے۔ انہوں نے کھل کر قہقہہ لگایا۔

''یار پہلے بتا دیتے تمہیں تنخواہ پیشگی دلوا دیتے۔''

پندرہ منٹ میں میری تنخواہ میرے ہاتھ میں تھی۔

لنچ کے وقفے میں بھاگم بھاگ ہاسٹل پہنچا۔ شفیع صاحب اپنے تام جھام سمیت برآمدے میں ڈیرہ لگائے بیٹھے تھے۔

بہت ساری معذرتوں کے ساتھ رقم ان کی طرف بڑھائی۔ اُنہوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ رجسٹر کھولا۔ ایک دو صفحات اُلٹے اور پھر فتویٰ صادر کر دیا۔

''تمہارا بل ادا ہو چکا ہے۔''

میں نے حیرانی سے اصرار کیا ''شفیع صاحب! لیکن میں نے تو......''

اُنہوں نے کھلا رجسٹر میری آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ میں حیران تھا کہ میرا محسن کون ہوسکتا ہے!

آخری بڑی مشکل سے شفیع صاحب تھوڑا سا پھوٹے۔ اُن کی نگاہیں پلٹ کر دم بھر کو خاں صاحب کے دفتر پر ٹھہر گئیں۔

شدید خواہش کے باوجود ہمت نہ ہوئی کہ خاں صاحب سے مل کر اُن کا شکریہ ادا کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ خاں صاحب کی یہ دریا دلی صرف میرے لیے نہ تھی۔ نجانے کتنے طالب علم اس طرح اُن سے مستفید ہوئے ہوں گے۔

زندگی نے ایک دم سے پلٹا کھایا۔ میں میونسپل کالج لائل پور سے ہوتا ہوا کراچی آ ٹپکا۔ اور پھر ایک ڈیڑھ سال کی ملازمت کے بعد تقدیر گوروں کے دیس لے آئی۔ ارادہ تھا کہ تعلیمی استعداد میں اضافہ کریں گے لیکن اس سے پہلے کچھ قدم جمانے ضروری تھے۔ لنڈن کونٹی کونسل میں انگریزی کے استاد کے لیے درخواست دی۔ انٹرویو ہوا اور ہمیں لنڈن کونٹی کونسل کے سپلائی ٹیچرز کی لسٹ پر ڈال دیا گیا۔

ہم نے اپنی ڈگری کی نقل وغیرہ جمع کرا دی اور انگریز بچوں کی انگریزی کی نوک پلک درست کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ہمیں ٹیچر کا کم ترین اسکیل دے دیا گیا۔ اصلی اسکیل اور بقایاجات ڈگری کے پاکستان سے کنفرم ہونے پر چھوڑ دیا گیا۔

ہر پندھواڑے کونٹی کا ایک خط ملتا۔ ''ہم نے ایک اور ریمائنڈر پنجاب یونیورسٹی کو بھیج دیا۔ جواب کے منتظر ہیں۔''

ہوتے ہوتے چھ ماہ گزر گئے۔ ہمیں مالی لحاظ سے تنگی نہ تھی۔ کونٹی کا سب سے نچلا اسکیل بھی ہمارے لیے کافی ہی نہیں، کافی سے زیادہ تھا۔ ایک خلش سی رہتی تھی۔ ہمارے یونیورسٹی والے افیم کھا کر سوئے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو غصہ آنے لگتا تھا۔ کونٹی والے کیا سوچتے ہوں گے!

اچانک اِدھر اُدھر سے اُڑتی اُڑتی خبر ملی کہ حمید احمد خاں صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں۔

فوراً خط لکھا۔ انہیں وائس چانسلر بننے پر مبارک باد پیش کی......اور ساتھ میں اپنی ڈگری کا رونا بھی رو دیا۔

خدشہ تھا کہ خط کہیں نیچے کلرک کو کرسی میں ہی دفن ہو کر نہ رہ جائے...... اس لیے لفافے کے اُوپر جلی حروف میں ''پرائیویٹ'' لکھنا نہ بھولے۔

لنڈن کونٹی کونسل کا اگلا خط پچھلے خطوں سے مختلف تھا۔

''ڈگری کی کنفرمیشن آ گئی ہے...... آپ کا نیا اسکیل فکس کر دیا گیا ہے...... جو فرق بنتا ہے وہ رقم آپ کے بنک میں پہنچ گئی ہے...... تفصیل والی سلپ منسلک ہے۔''

ہم نے نعرہ لگایا ''خاں صاحب زندہ باد''

دیارِ غیر میں ہزاروں میلوں کے فاصلے پر بیٹھے خاں صاحب یہاں بھی ہمارے ساتھ تھے۔

یہ چند ایک واقعات تھے جو ضبطِ تحریر میں لایا ہوں۔ خاں صاحب نے ہر ہر موقعے پر، کبھی سختی سے، کبھی انتہائی شفقت سے ہماری قدم قدم پر رہنمائی کی۔ اس دور میں کالج تعلیمی درست گاہیں تو تھیں، ساتھ میں طالب علموں کے کردار سازی پر خاصی توجہ دی جاتی تھی اور اُستاد صحیح معنوں میں رول ماڈل ہوا کرتے تھے اور خاں صاحب طالب علموں کے علاوہ اساتذہ کے بھی رول ماڈل تھے۔

کیا ڈھونڈیں...... لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں......

میں کیوں لکھتا ہوں؟

جمیل یوسف/مری

میں کیوں لکھتا ہوں؟ میرے نزدیک اس سوال کا مختصر ترین مگر جامع جواب تو یہ ہے کہ میں اس لئے لکھتا ہوں کہ مجھے خود اپنی معرفت حاصل ہو۔ جتنی دیر میں لکھنے کے عمل میں مصروف رہتا ہوں اتنی دیر میری ملاقات خود اپنے آپ سے رہتی ہے۔ سید عبدالحمید عدم نے کچھ اس طرح کی بات کسی ہمدم اور ہم مزاج دوست سے یا صحیح معنوں میں کسی بڑی شخصیت سے ملاقات کے بارے میں کہی تھی:

بعض اوقات کسی اور کے ملنے سے عدم
اپنی ہستی سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے

میرا خیال ہے کسی اور سے ملنے کے مقابلے میں ایک ادیب اور شاعر کے لئے لکھنے کا عمل ایک ایسا تجربہ ہے جس کے دوران صحیح معنوں میں اس کی ملاقات اپنے آپ سے ہوتی ہے۔ اس گہری اور پراسرار واردات کو بیان کرنے کے لئے آپ یوں کہہ لیجئے کہ ایک ادیب اور شاعر خود اپنے تخلیقی عمل سے اپنی ذات کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اپنی ذات کی معرفت کے حصول کا یہ عمل اپنے اندر کچھ ایسی لذت رکھتا ہے کہ ایک سچا ادیب اور شاعر بار بار تخلیقی عمل کے اس تجربے سے گزرنا چاہتا ہے۔ اس طرح اسے اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے جس طرح ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ: ''I think therefore I am'' یعنی میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں۔ اسی طرح میں جب لکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں ہوں۔ وہی بات جو اقبال نے موج کے بارے میں کہی تھی:

موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نروم، نیستم

آپ مہدی حسن سے پوچھئے جب وہ گا رہا ہوتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہوگا جیسے وہ صحیح معنوں میں زندہ ہے ورنہ باقی زندگی تو محض سانس کی آمد وشد ہے۔ جیسے میں نے کہا ہے:

دیکھتا ہوں ہر طرف، پر کچھ نظر آتا نہیں
دن کے ہنگامے میں بھی سویا ہوا رہتا ہوں
میرے خدوخال کو پہچاننا، آساں نہیں
راستے کی گرد میں اکثر اٹا رہتا ہوں میں
ہر گھڑی ہر مقام پر کس کی تلاش تھی ہمیں
دنیا کے جتنے کام تھے جی کا وبال ہو گئے

یہ تلاش اسی تخلیقی لمحے کی ہے جو ایک فنکار کے وجود کو زندگی کے لمس سے آشنا کرتا ہے۔ اس آشنائی میں وہ لذت ہے جس پر اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے، لذت آشنائی

میرا ایک شعر ہے:

دنیا بھی ہیچ، دولت دنیا بھی ہیچ ہے
پہنچا کہاں ہوں نشۂ فکرِ سخن کے ساتھ

یہ نشۂ فکرِ سخن اور لذتِ آشنائی ایک ایسا اسرار ہے جو مجھے اپنی اصلیت یا ماہیت سے روشناس کرتا ہے۔ انسان کی اصلیت کیا ہے۔ غالب نے کہا تھا:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

حقیقت یہ ہے کہ تخلیقِ فن کے لمحوں میں فنکار کو جو معرفتِ ذات حاصل ہوتی ہے، وہ معرفت حق ہے۔ اسی معرفت حق کے کسی مرحلے میں منصور نے اناالحق کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اسی تناظر اور سیاق وسباق میں شیکسپیئر نے Prophets اور Poets کو باہم بریکٹ کر دیا تھا۔ احسان دانش کا کیا خوبصورت شعر ہے:

شاعری کی کسی منزلِ درد میں
اک دریچہ ہے پیغمبری کی طرف

اگر تخلیق فن کے لمحوں میں تخلیق کار اس منزل درد سے بیگانہ اور بے خبر رہتا ہے اور اس کی رسائی اس منزل تک نہیں ہو پاتی بلکہ اگر اسے کسی ایسی منزل کا شعور ہی نہیں تو ایسا شخص ہرگز تخلیق کار نہیں ہے، محض نقال ہے۔ اس منزل درد تک رسائی اور اس کا ادراک تخلیق کار کو منور کر دیتا ہے۔ اسی نور سے مستنیر ہو کر کیٹس اس نتیجے پر پہنچا تھا:

Beauty is truth`truth beauty,
That is all, ye know and all`ye
need to know

تخلیق کے عمل کی بدولت ہی انسان صحیح معنوں میں خالق حقیقی کی خلافت کے منصب پر متمکن ہوتا ہے۔ اسی سطح سے اقبال نے اللہ تعالیٰ کو یوں مخاطب کیا تھا:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اللہ تعالیٰ بھی خود اپنی تخلیق سے اپنی ذات کی معرفت اور اپنی بے کراں قوتوں کے لامحدود امکانات کی پہچان کے اسباب فراہم کر رہا ہے اور مسلسل اس عمل میں مشغول ہے۔ بقول غالب:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

خالق کائنات مسلسل تخلیقِ پیہم سے اپنے وجود کا اثبات کر رہا ہے۔ اقبال نے ایک قرآنی آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید !
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

خالق کائنات چونکہ عظیم ترین خالق ہے۔ وہ مسلسل اور پیہم تخلیق کے عمل میں مشغول رہ سکتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ نہ تو اسے نیند آتی ہے نہ وہ تھکتا ہے نہ وہ کسی لمحے غافل ہوتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے مگر انسان کے روپ میں جو تخلیق کار ہے وہ ہر چیز پر قادر نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کسی چیز پر قادر نہیں۔ وہ اپنی حیات مستعار میں، تخلیق کے ہر لمحے کو ہر وقت اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتا۔ یہیں سے اس کا المیہ جنم لیتا ہے، بقول غالب:

عالم، غبار دشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

بہرحال ایک فنکار کی کوشش اور خواہش یہی ہوتی ہے کہ تخلیقی لمحے کے حسن سے جس قدر ہو سکے لذت یاب اور مستنیر ہو کیونکہ اس کے لئے حقیقت میں زندگی یہی ہے۔ میں نے کہا ہے:

زندہ تھا اگر میں تو ترے حسن کے دم سے
اے کاش جو تو سامنے رہتا کوئی دن اور

تو گویا لکھنے کا عمل میرے لئے اس لئے ضروری ہے کہ یہ میرے لئے زندگی بخش اور حیات آفریں ہے۔ وہی لسفی کا قول کہ "I think therefore I am." میں کہوں گا ''I write. therefore I am'' یہ تو اس سوال کا جواب ہوا کہ میں کیوں لکھتا ہوں۔ اسی سے ملتا جلتا بلکہ اس سے بڑا گہرا تعلق رکھنے والا سوال ہے کہ میں کیا لکھتا ہوں۔ اس سوال کا جواب دیئے بغیر پہلے سوال کا جواب بھی نامکمل رہتا ہے اور بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

''میں کیا لکھتا ہوں؟'' کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ میں وہی کچھ لکھتا ہوں جو کچھ مجھ پر گزرتی ہے۔ میرے وجود کے باہر واقعات وحادثات اور اس کے ردعمل کے طور پر جنم لینے والے میرے اندر کے احساسات وجذبات۔

داخلیت اور خارجیت کی بحث جتنی پرانی ہے اتنی ہی لایعنی بھی۔ یہ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر عبدالوحید قریشی جیسے مدرس نقادوں کے چونچلے ہیں ورنہ ایک شاعر اور ادیب کے ہاں داخلیت اور خارجیت میں کوئی بُعد نہیں ہوتا، کوئی حد فاصل نہیں ہوتی۔ دونوں قسم کی وارداتوں میں کوئی تضاد، دوئی یا تقسیم نہیں ہوتی۔ داخلی جذبات واحساسات کو یکسر منہا کر کے صرف خارج کی بات کرنا اخباری رپورٹر کا کام ہے، کسی ادیب یا شاعر کا نہیں۔ جب تک کوئی واردات یا تجربہ لہو میں رچ بس نہ جائے تخلیق کا روپ نہیں دھارتا: جانے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک یا پھر:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

شاعر کی ذات، دنیا کے اس ماحول سے الگ نہیں ہے جس میں وہ رہ رہا ہے۔ وہ معاشرے کا احساس ترین فرد ہے۔ اس حوالے سے حالات کے جور وستم کا زخم اس پر زیادہ گہرا لگتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے الگ تھلگ کہاں رہ سکتا ہے۔ میرے اس شعر میں اسی جانب اشارہ ہے:

میں اپنے حالِ زبوں پر نگاہ کیا کرتا
تنی ہوئی مرے سر پہ کماں ہی ایسی تھی

سچی بات تو یہ ہے:

زمانے کو وہ اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے
حقیقت میں ہم اپنی داستاں تحریر کرتے ہیں

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: 24-j ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

تحقیق کے زاویے

ڈاکٹر مختار عزمی/لاہور

کچھ ہوش سنبھالتے ہی انسان اپنے گرد وپیش پر نگاہ کرتا ہے۔کون، کیوں، کب، کیسے، کہاں اور ایسے ہی کئی سوالات اس کے ذہن میں آتے ہیں۔وہ ہر لمحہ ہر شے کو متجسس نظروں سے دیکھتا ہے۔اسے مسلسل مشاہدات اور تجربات سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ عمر بھر اس کی چھان پھٹک میں لگا رہتا ہے یہی تحقیق کا عمل ہے۔عربی زبان کے لفظ ''تحقیق'' اور حقیقت کا مادہ ایک ہی ہے یعنی حق یا سچائی کی تلاش۔

اگرچہ تحقیق ایک لامتناہی عمل ہے اور قدرے ایک ناخوش گوار عمل ہے مگر اِسے خوش گوار عمل ہونا چاہیے۔بعض لوگوں نے اسے ایک مشکل اور اکتا دینے والا عمل بنا دیا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ نئے لوگ شعبہ تحقیق میں آنے سے ڈرتے ہیں۔بعضے سمجھتے ہیں کہ تحقیق تارک الدنیا لوگوں کا کام ہے۔راقم نے خود بھی ۱۹۹۲ء میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھا تھا:

''تحقیق کے لئے عمر ساری نہیں تو آدھی پونی ضرور کھپانی پڑتی ہے تب کہیں مصرعہ تر کی صورت پیدا ہوتی ہے۔اس وادیء پُرخار سے جو گزرے سو جانے۔''(۱)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

تحقیق کا جنگل شیروں سے اسی لئے خالی ہو چکا کہ شیروں جیسا حوصلہ باقی نہیں رہا ورنہ جنگل میں شکار تو وافر ہے۔دوسرے لفظوں میں سوز و ساز رومی رہا، نہ پیچ و تاب رازی۔تحقیق میں جان مار کے جو لذت ملتی، وہ ہر کسی کے نصیب میں کہاں؟

طالب علموں کے لئے، تحقیق کی کتابوں میں تحقیق کے معانی و مصادر پر کافی مباحث ملتے ہیں۔ تحقیق کے زاویوں پر بات کریں تو اس کے کئی پہلو اور کئی زاویے ہیں۔مگر مقصد سب کا ایک ہے یعنی سچائی اور حقیقت کی تلاش۔

اس حوالے سے سید جمیل احمد رضوی کا کہنا بجا ہے:

''تحقیق اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعے سے مسائل کے قابلِ اعتبار حل تک پہنچا جاتا ہے اور اس میں منصوبہ بندی اور با ضابطہ طریقے سے معلومات (Data) کو جمع کیا جاتا ہے۔ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کی توجیہ و تعبیر کی جاتی ہے۔تحقیق کے ذریعے سے علم کو دریافت کیا جاتا ہے۔''(۲)

سچائی یا حقیقت کے کئی زاویے اور کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ہر شخص، ہر گروہ یا قوم کی اپنی ایک سچائی ہے اور صداقت کا اپنا ایک معیار ہے۔اسی طرح کل کی سچائی اور تھی۔وقت بدلنے کے ساتھ کتنی نئی سچائیاں سامنے آ چکی ہیں۔تو پھر سچائی کیا ہوئی؟ کیا سچائی ایک اضافی صفت ہے؟ قاضی عبدالودود کہتے ہیں:

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔کوشش کا لفظ ارادۃً استعمال ہوا ہے۔وجہ یہ ہے کہ دیکھنا اور دیکھنے کی کوشش کرنا ایک نہیں ہے۔کوشش کامیاب بھی ہوتی ہے اور ناکام بھی۔ناکامی کبھی جزوی بھی ہوتی ہے، کبھی کُلی۔ایک امریکی مصنف سٹریل کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ خارجی حقیقت کا وجود نہیں۔مجھے اس سے انکار نہیں۔حقیقت موجود ہے۔یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے پاس اس کے دریافت کرنے کے نامکمل ذرائع ہوں۔(۳)

تحقیق محض واقعات جمع کرنے کا نام نہیں دلائل و شواہد اور تجربہ و تجزیہ کے ذریعے نتائج تک پہنچنے کی کوشش ہے۔اب مندرجہ بالا سوال پر ایک بار پھر غور کیا جانا چاہیے کہ تحقیقی عمل کی مطلوبہ سچائی کہاں ہے؟ اس موقع پر انسانی کاوشوں کی کامیابی اور سربلندی کے باوجود اظہارِ عجز ہی کرنا پڑتا ہے کہ بقولِ اقبال:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

چوں کہ تحقیق کے اصول عقلی ہیں اس لئے دیگر عقلی اصولوں کی طرح تغیر پذیر ہیں۔چنانچہ نئی سچائی منظر عام پر آنے کے بعد پُرانی سچائی اپنا اعتبار کھو دیتی ہے۔اہلِ سائنس کے ہاں اس کا چلن عام ہے۔اردو ادب میں بھی اب یہ روش عام ہو چلی ہے۔مثلاً حضرت نوشہ گنج بخشؒ (۱۵۵۲-۱۶۵۴ء) کے ملفوظات منظر عام پر آنے کے بعد اردو کا پہلا شاعر ہونے کا اعزاز اب دکنی شعرا کے بجائے پنجاب کے حضرت نوشہ گنج بخش کے سر سجتا ہے۔

نئی سچائیوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ، تحقیق کا

ایک اور اہم زاویہ ،معلوم حقائق میں اضافہ کرنا بھی ہے ۔مثلاً مولانا محمد حسین آزاد کے بارے ڈاکٹر محمد صادق نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں کئی ایک حقائق کا اضافہ کر کے انہیں اپ ڈیٹ کیا ہے۔اسی طرح کی ایک کاوش علی اکبر ناطق نے کی ہے۔انہوں نے شعبہ اُردو منہاج یونیورسٹی لاہور میں'' مولانا محمد حسین آزاد کے مساکن واسفار'' کے موضوع پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھ کر آزاد کے حوالے سے معلوم حقائق میں کئی ایک اضافے کئے ہیں ۔رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''جب بھی ایسی نئی معلومات حاصل ہوں گی جو اصولِ تحقیق کے مطابق قابلِ قبول ہوں تو اسے لازمی قبول کر لیا جائے گا۔خواہ وہ نئی معلومات پچھلے مسلمات کے تکذیب کرتی ہوں یا ان کی مزید تصدیق کرتی ہوں یا اس کی مدد سے اضافے ممکن ہوں۔دریافت کا عمل اسی طرح جاری رہے گا اور ردو قبول کے احکام بھی اسی طرح کارفرما رہیں گے''(۴)

دیگر محققین کی طرح ڈاکٹر ہارون قادر بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''محقق کو کوشش کرنی چاہیے کی ان کی تصنیف و تالیف میں صحت اور بات میں سچائی اور گہرائی ہو۔کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے نہ ہو''(۵)

تحقیق کی کئی اقسام ہیں۔جن میں سے بیانیہ تحقیق ،تجرباتی تحقیق،تجزیاتی تحقیق ۔عمرانی تحقیق، تعلیمی تحقیق اور تاریخی تحقیق اہم ہیں۔

بیانیہ تحقیق (Descriptive Research) میں نثر نگاروں،شاعروں اور عالموں کے احوال و آثار،خطوط،سروے اور انٹرویوز شامل کئے جاتے ہیں۔اس حوالے سے پروفیسر امجد علی شاکر لکھتے ہیں:

'' بیانیہ تحقیق مشاہدے سے حاصل ہونے والی معلومات کا وہ باضابطہ مجموعہ ہے جس کے ساتھ مشاہدے کا تجزیہ اور اس سے حاصل ہونے والے اصول بھی شامل ہیں۔مگر اس کا دائرہ کار وہاں رک جائے گا جہاں متغیرات کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کا پیچیدہ عمل شروع ہو جائے۔''(۶)

تجرباتی تحقیق(Experimental Research)میں ایک متغیر عنصر یا زیادہ کے دوسرے متغیر عنصر یا زیادہ پر اثرات کے حوالے سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس بارے خالد رشید کہتے ہیں:

'' ہر تجربے میں دو قسم کے متغیرات سے واسطہ رہتا ہے۔یعنی آزاد متغیرات اور تابع متغیرات۔اس قسم کی تحقیق میں تابع متغیرات کو قابو میں رکھتے ہوئے،آزاد متغیرات کے ان پر مرتب ہونے والے اثرات تحقیق کا موضوع قرار پاتے ہیں''(۷)

اردو زبان بالخصوص شاعری کی عمر کم و بیش ایک ہزار سال بنتی ہے مگر تحقیق کے حوالے سے اردو ابھی کم عمر ہے۔شاعری کے حوالے سے اس کی عمر کی تصدیق حضرت امیر خسروؒ کے دیباچہ غرۃ الکمال سے ہوتی ہے۔مسعود سعد سلمان (۱۱۲۱_۱۰۴۶ء) کو بالاتفاق اردو کا پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔اردو شعرا کے تذکرے تحقیق اور تنقید کی پہلی کڑی سمجھے جاتے ہیں۔یوں تو سبھی تذکرے اپنی ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں مگر فرانسیسی مستشرق،گارسیں دتاسی کا تذکرہ (۸) بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں معلومات کا وافر ذخیرہ پایا جاتا ہے۔بہ قول ڈاکٹر امجد علی شاکر:

''گارسیں دتاسی نے تاریخ ادبیات کو جس وسعت میں دیکھا ہے وہ قابل دید ہی نہیں،قابل داد بھی ہے۔''(۹)

سر سید احمد خان اور ان کے رفقا نے تحقیق کا سائنسی انداز اختیار کیا ہے۔سرسید کو دیگر کئی شعبوں کے علاوہ اردو میں سائنسی اور تاریخی تحقیق کا بھی امام سمجھا جاتا ہے۔پنجاب بالخصوص لاہور میں ، قیام پاکستان سے قبل تحقیقی اور سائنسی شعور بیدار کرنے میں ڈاکٹر لائٹنر،مولانا آزاد،مولانا حالی اور ڈاکٹر حافظ محمود شیرانی کا گراں قدر حصہ ہے۔آخرالذکر کو اردو تحقیق کا معلم اول کہنا بجا ہے۔امتیاز علی عرشی نے تحقیقات غالب میں بڑا نام پایا ہے۔قاضی عبدالودود کے ہاں کڑا تحقیقی معیار ملتا ہے۔مالک رام بھی ایک اچھے محقق ہیں۔رشید حسن خاں نے باغ و بہار اور فسانہ عجائب کے علاوہ کئی اہم کلاسیکی کتب کو اعلیٰ تحقیقی و تدوینی پیمانے پر مرتب کیا ہے۔اردو املا پر ان کی کتاب خاصے کی چیز ہے۔پروفیسر نذیر احمد ایک ماہر لغات و مخطوطہ شناس مانے جاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد،اردو تحقیق کے شعبہ میں نمایاں کام ہوا ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی نے مخطوطہ شناسی اور تحقیق و تدوین میں دبستان پنجاب کے معیار کو قائم رکھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے دکنی ادب پر گراں قدر تحقیقی و تدوینی کام کیا ہے۔(۱۰) ان کے استاد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں تصوف کے علاوہ دوسرے پہلوؤں پر بھی داد تحقیق دی ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے دبستان کراچی نے کے تحقیقی معیار کو سربلند کیا ہے۔تاریخی اصول پر ان کی مرتب کردہ اردو لغت ایک بڑا کام ہے۔مولانا غلام رسول

مہر، شیخ محمد اکرام اور اکرام چغتائی نے بھی تحقیق میں عمدہ کام کیا ہے۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اپنے دادا کے مقابلے میں کم مگر معیاری کام کیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں 'تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند' کی تحقیق وتدوین ایک عمدہ کام ہے جس کو ڈاکٹر خواجہ زکریا نے نظر ثانی کے بعد مزید ثروت مند بنا دیا ہے۔ پنجاب (پاکستان) کے دو بڑے ہمسایہ اداروں پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اردو میں تحقیق وتدوین کی اعلیٰ روایات قائم ہو چکی ہیں۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، پشاور یونیورسٹی، نمل یونیورسٹی اسلام آباد اور منہاج یونیورسٹی لاہور میں تحقیق و تدوین بالخصوص سندی تحقیق کے حوالے سے اعلیٰ، درمیانہ اور ادنیٰ، ہر سطح کا کام ہورہا ہے۔ پاکستان میں، بیسویں صدی میں، جہاں دکنی دبستانِ تحقیق اور لاہوری دبستانِ تحقیق کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، وہاں اکیسویں صدی میں دیگر اصناف نظم و نثر کی طرح، پاکستانی دبستانِ تحقیق کے اپنے نقوش بھی واضح ہورہے ہیں۔ یہ بھارتی دبستانِ تحقیق سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد عطاءاللہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک پاکستان میں ادبی تحقیق کے نمایاں رجحانات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں تصحیحِ متن، مشاہیرِ ادب کے سوانحی حالات اور تصانیف کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، مختلف اصنافِ ادب اور لسانیاتی مطالعے محققین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں'' (۱۱)

تحقیق کے بیسوؤں زاویے (بل کہ بدلتے ہوئے زاویے) محققین کا مرکزِ نگاہ بنتے ہیں۔ اسے کئی ان دیکھے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ میرے خیال میں موضوع کا انتخاب اور جیون ساتھی کا انتخاب، دونوں ہی مشکل ہیں۔ جو موضوع (یا ساتھی) ایک بار لے لیا پھر عمر بھر اس کے ساتھ نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر موضوع یا ساتھی لے کر کچھ عرصہ کے بعد اسے بہ وجوہ چھوڑنا پڑے تو کیفیت ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' کی سی ہو جاتی ہے۔ بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑنا بڑی خجالت کا باعث بنتا ہے۔ سندی تحقیق کے لئے تیار کئے گئے اور بہ وجوہ مسترد کئے گئے خاکہ جات Synoposis/ کے محققین بین کرتے پائے گئے ہیں۔

تحقیقی موضوعات بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ حصولِ سند کے لئے یا پھر اپنی پسند اور ضرورت کے تحت۔ مغرب میں تحقیقی مقالات کے لئے Thesis اور Treatise کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ تحقیقی مضوعات کسی نہ کسی سوال یا مسئلہ کو لے کر چلتے ہیں اور اس کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ گیان چند جین نے تحقیقی موضوعات کی دس اقسام کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً کوئی ایک ادیب (یا شاعر)، صنفِ ادب، رجحان، تحریک، دبستان، علاقائی گروہی جائزہ، کوئی انجمن یا ادارہ، کسی ایک کتاب کا جائزہ (یا ترجمہ)، تدوینِ متن، ادبی حوالہ جاتی کتابیں، بین العلومی تحقیق اور ادبی لسانیات وغیرہ (۱۲)

زندگی کے دیگر اطوار کی طرح اردو زبان وادب کے موضوعات میں بھی، ہر دور میں کوئی نہ کوئی فیشن حاوی رہا ہے۔ دیگر فیشنوں کی طرح تحقیق کا فیشن بھی بدلتا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ 'دکن میں اردو' کے بعد 'پنجاب میں اردو' لکھی گئی۔ پھر سندھ میں اردو، بلوچستان میں اردو اور بنگال میں اردو شائع ہوئیں۔ اس طرح علاقوں کے سابقوں سے ''۔۔۔ میں اردو'' کا سلسلہ چلتا رہا۔ شخصیاتی عنوانات سے 'احوال وآثار' کا فیشن بھی کئی برس رہا۔ کچھ نئے محققین (اب ریسرچ سکالرز) نے احوال و آثار کی جگہ ''فلاں، شخصیت اور فن'' کو اپنا لیا۔ یہ شخصیت اور فن کا فیشن بھی اب متروک ہوتا جارہا ہے۔ اکیسویں صدی طلوع ہوئی تو اس کی شامت آ گئی۔ اب متلاشیان سند اکیسویں صدی میں اردو ناول، اکیسویں صدی میں اردو غزل، اکیسویں صدی میں اردو نظم اکیسویں صدی میں اردو افسانہ۔ اکیسویں صدی میں یہ۔۔ اور اکیسویں صدی میں وہ۔۔۔ وغیرہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

در حقیقت سندی تحقیق کے لئے لکھا گیا مقالہ Thesis/Dissertation تو اولاً سند ہی کے لئے ہوتا ہے۔ پتا تو سند پانے کے بعد چلتا ہے۔ کیا مذکورہ سکالر محض سند لے کر اور مقررہ پانچ دس ہزار روپے الاؤنس لے کر گم ہو گیا ہے یا اس کا شوقِ تحقیق باقی ہے۔ ملک وقوم اور حکومت اسی لئے تحقیق کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ نئے سے نئے لوگ آتے رہیں اور نئی سے نئی راہیں تلاشتے رہیں۔ زبان وادب کی تحقیق کے لئے مختلف دبستانوں پر، مختلف تحریکات پر، اصنافِ ادب پر، مختلف علاقوں اور اداروں پر اچھا کام ہوسکتا ہے۔ تحقیق اور تدوین متن پر بھی کام کی گنجائش موجود ہے۔ مختلف زبانوں کے شہپاروں کے تراجم کی بھی کافی ضرورت ہے۔

تحقیق اور تدوین میں داخلی اور خارجی زاویے نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ مستند بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مستند بھی۔ یہ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی چھان پھٹک کے بعد ہی ان کو قبول یا رد کیا جا سکتا ہے۔ تواریخ زبان وادب کی کتب، شعرا کے تذکرے بیاضیں، تہذیبی کتب، سفر نامے، روزنامچے، مکاتیب، آپ بیتیاں، اخبارات ورسائل، معاصر تصانیف، انسائیکلو پیڈیا، فرہنگ، تحقیقی ادارے۔ مخطوطات، مسکوکات، ملفوظات، انٹرویوز، دستاویزات، سرکاری ریکارڈ، تاریخ گوئی، سمعی و بصری معاونات اور انٹرنیٹ کو داخلی وخارجی تحقیقی ماخذ اور وسائل تحقیق قرار دیا جاتا ہے۔

تحقیق کے لئے بنیادی ماخذ حد درجہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ۔ان کے بعد ثانوی ماخذ آتے ہیں۔ تجزیے اور استخراج نتائج کا دارومدار انہی پر ہوتا ہے۔ محدثین کرام نے تدوینِ احادیث کے لئے اسماء الرجال سے مدد لی ہے جو بنیادی اور ثانوی ماخذ کے تعین میں مدد کرتے ہیں۔ ادبی تحقیق میں ادبا وشعرا کی تصانیف اور متعلقہ دستاویزات بنیادی ماخذ ہوں گی۔ مصنف کے مسودے، بالخصوص وہ جن میں ترمیم و اضافہ وتصحیح کی گئی ہو۔ اس کے خطوط، ڈائری، خود نوشت حالات، یادداشتیں، مطبوعہ تخلیقات، میونسپلٹی کا رجسٹر بابت پیدائش و موت، تعلیمی ریکارڈ وغیرہ کو بنیادی ماخذ کی ذیل میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر جین کے مطابق ثانوی ماخذ وہ ہیں جو دوسروں نے مذکورہ ادیب وشاعر کے بارے میں لکھا ہو۔ مثلاً مختلف تذکروں، تواریخ ادب اور انسائیکلو پیڈیا میں اس کے حالات، اس کے اہلِ خاندان اور دوسروں کے خطوط اور یادداشتیں، اس کے بارے اخبارات ورسائل میں شائع ہونے والی تحریریں اور اس کی غیر ادبی تحریریں وغیرہ (۱۳)

تحقیق میں بنیادی حوالہ ہو یا ثانوی حوالہ، ان کا طریقہ اندراج بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ صرف اردو تحقیق کی بات نہیں بل کہ کسی بھی زبان وادب کی تحقیق کے ابتدائی زمانے میں کوئی خاص طریقہ اندراج نہ تھا۔ مصنف کی ذات ہی صداقت کا معیار سمجھی جاتی تھی۔ جس کو یقین کرنا ہے، کرے۔ نہیں کرنا تو نہ کرے۔ اردو میں تحقیق کے معلم اول پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود شیرانی اور ان کے ہم عصر محققین نے اندراج حوالہ کے جدید طریقے متعارف کرائے جو کہ ماڈرن لینگویج ایسوسی ایشن کے فارمیٹ کے مطابق بنائے گئے تھے۔ مثلاً: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام،، ناشر، شہر، سال اشاعت، صفحہ نمبر اگر اسی کتاب اور اسی صفحے کا دوبارہ حوالہ مقصود ہو تو '' ایضاً'' لکھ دیا جاتا ہے۔ اگر صفحہ نمبر مختلف ہو تو '' ایضاً، صفحہ نمبر '' ڈال دیا جاتا ہے۔ اردو تحقیق کے آغاز میں حوالوں کا اندراج رواں عبارت میں نمبر شمار ڈال کر اُسی صفحے کے نیچے حاشیے سے باہر درج کر دیتے تھے جسے فٹ نوٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اب اس کا رواج کم ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے قاری دی گئی عبارت کی تصدیق کر سکتا ہے۔

آج کل ایک اور صورت میں بھی حوالے دئے جا رہے ہیں یعنی رواں عبارت میں، قوسین میں مصنف کا معروف نام، کتاب کا سنہ اشاعت اور صفحہ نمبر مثلاً (حالی:۱۹۹۰:۴۴) awpr slwn barniT ka Hwlo bhi dikhuy.۔یہ حوالہ فٹ نوٹ میں بھی نمبر شمار کے تحت دیا جاتا ہے مثلاً ہ کے آخر میں اس طرح لکھا جاتا ہے ۔۲۔ حالی، مقدمہ شعر وشاعری، ص۴۴

تحقیقی مقالے کے اندر یا آخر میں حوالہ جات و حواشی لکھنے کے بعد کتابیات/Bibliography بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ سائنسی مضامین کہ جن میں لیبارٹریز میں تجربات کئے جاتے ہیں، اب محض حوالہ جات ہی کافی سمجھے جاتے ہیں، تاہم سوشل سائنسز اور آرٹس ے مضامین میں کتابیات بھی درج کی جاتی ہے۔ اس کی صورت کچھ یوں ہوتی ہے:

مصنف یا مئولف کا معروف نام، باقی نام، کتاب کا نام، ناشر، شہر، سال اشاعت۔

قادر، ہارون، ابجدِ تحقیق۔ الوقار پبلشرز، واپڈا ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

یہ طریقہ ایم ایل اے Modern Language Association کا طریقہ کہلاتا ہے۔ اسی کو اے پی اے American Psychological Association/ کے طریقے کے مطابق یوں لکھیں گے۔

قادر، ہارون (۲۰۰۹ء)، ابجدِ تحقیق۔ لاہور۔ الوقار پبلشرز واپڈا ٹاؤن۔

قابل غور بات یہ کہ کتابیات میں ایک مصنف یا کتاب کا حوالہ کا ذکر ایک ہی بار آئے گا مگر حوالہ و حواشی کے ضمن میں ایک سے زائد بار بھی آ سکتا ہے ۔ پہلے فٹ نوٹ اور پھر کتابیات کی دوہری مشقت سے مقالہ نگار کو بچانے کے لئے ایم ایل اے مینول میں سلوان بارنیٹ نے ۱۹۸۴ء میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ ان تبدیلیوں کے پسِ منظر میں ڈاکٹر محمد عطاء

اللہ لکھتے ہیں:

''غالباً سیلون بارنیٹ(Barnet: 1996:329) کے اس اقتباس کے بعد ہمیں اس سوال کا تسلی بخش جواب مل جاتا ہے کہ ہم کتابیات مصنف کے آخری نام کی الف بائی ترتیب سے کیوں درج کرتے ہیں۔لیکن کتابیات کے اندراج کا یہ طریقہ تبھی مفید ہے جب حوالہ جدید طریقے سے دیا جائے۔ورنہ اگر تمام تفصیلات فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی تو نہ صرف مقالہ نگار کا وقت ضائع ہو گا اور کمپیوٹر کمپوزنگ میں مشکلات پیدا ہوں گی بل کہ کتابیات درج کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''(۱۴)

کمپیوٹر کی آمد کے بعد،یوں سمجھئے کہ اکیسویں صدی کے آغاز سے اب آن لائن حوالے کا رواج بڑھ گیا ہے۔مثلاً

www.iqbalcyberlibrary.netat 8.30pm

ہر علم اور فن کی ایک خاص زبان ہوتی ہے۔فن تحقیق کی زبان سادہ اور عام فہم ہونی چاہیے۔یہ معروضی زبان ہوتی ہے،دو اور دو چار کی طرح۔ڈاکٹر امجد علی شاکر لکھتے ہیں:

''معروضیت تحقیق کی بنیادی صفت ہے۔اس لئے اس میں واحد متکلم کا گزر نہیں۔اردو زبان کے محققین نے تحقیق مغرب سے سیکھی ہے۔۔۔۔اردو نے یہ اصول برطانوی محققین سے لئے ہیں۔انگریزوں کے ہاں فعل مجہول بہت پایا جاتا ہے۔وہ صفحے کے صفحے ایسے لکھ جائیں گے جن میں شاید ہی کوئی فقرہ فعل معروف (Active Voice) میں ہو۔واحد متکلم تو وہ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔''(۱۵)

گیان چند جین کا نکتہ نظر مختلف ہے۔ان کا خیال ہے کہ ضمیر متکلم کا استعمال کوئی ایسا جرم بھی نہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''تحقیقی مقالے میں بھی کچھ باتیں ضمیر متکلم کے ساتھ لکھنے کی مجبوری آجاتی ہے راقم الحروف اور راقم السطور کتنے مصنوعی اظہار ہیں۔ہم جیسا شاہانہ لفظ استعمال کرنا اردو کی خاکساری کے منافی ہے۔اور اگر یہ کہوں کہ راقم الحروف کو بتائی تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں کوئی کالا چور تو ہوں نہیں جو مجھے اپنی ذات کو سامنے لاتے ہوئے ہچکچاہٹ یا حجاب محسوس ہو''(۱۶)

بہ ہر حال تحقیق کی زبان سادہ اور معروضی ہونی چاہیے۔اس میں ابہام،افسانہ،شاعری،انشا پردازی، طنز وتعریض اور مبالغے کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ محقق کی سادہ زبان کی ایک مثال دن کی روشنی سے ہے۔روشنی بہ ظاہر سفید ہوتی ہے مگر یہ سات رنگوں کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔محقق کی بات سادہ ہو مگر سمجھ میں بھی آنی چاہیے۔اس میں غور وفکر کا سامان بھی ہونا چاہیے ۔ اس حوالے سے قران حکیم کی زبان اور احادیث مبارکہ کی زبان ہماری رہنمائی کرتی ہے۔محقق کو بات کہنے کا ڈھب آنا چاہیے۔اس کا اسلوب بامعنی اور حسبِ حال ہونا چاہیے۔ایک معیار یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ علمی نکات کم سے کم لفظوں میں ادا ہو جائیں۔ایجاز کی یہ خوبی گویا تلخیص نگاری نہ ہو بل کہ متوازن نگاری ہونی چاہیے۔ایک اچھے محقق کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے کیا لکھنا ہے مگر یہ بھی خبر ہو کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔اس سلسلے میں رشید حسن خاں کا ایک اقتباس دیکھئے:

''صد سالہ یادگار غالب کمیٹی نے غالب کا دیوان اردو شائع کیا ہے۔(آئندہ اس کو''صدی اڈیشن ''کہا جائے گا)مرتب:مالک رام صاحب۔ناشر صد سالہ یادگار غالب کمیٹی،دلی۔سال اشاعت ۱۹۶۹ء۔تدوین کے طلبہ کے لئے زیرِ بحث نسخہ ءدیوان غالب کا مطالعہ اس لحاظ سے ضروری معلاوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ بات معلوم ہو کہ کسی دیوان کو کس مرتب نہیں کرنا چاہیے۔اس اڈیشن کے مرتب نے تدوین کے اصولوں کو جس طرح نظر انداز کیا ہے ،اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ایک خاص بات یہ ہے کہ مرتب نے اس صدی اڈیشن کی بنیاد دیوانِ غالب کے جس نسخے پر رکھی ہے اور جس کے متعلق یہ دعوا کیا ہے کہ اس کی غلطیوں کی تصحیح غالب نے اپنے قلم سے کی تھی،اور جس کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ نسخہ حیدر آباد کی آصفیہ لائبریری میں موجود ہے۔،وہ نسخہ وہاں موجود ہی نہیں۔''(۱۷)

تحقیق کا ایک منفی زاویہ،آج کل زیادہ نمایاں ہو رہا ہے۔خاص طور سے سندی تحقیق کے لئے لکھے جانے والے مقالات میں طویل ترین تمہیدات اور پس منظری ابواب۔یہ کم وبیش اکثر مقالات میں نقل در نقل لکھے جا رہے ہیں۔چوں کہ لوگ خوگرِ پیکر محسوس ہوتے ہیں اور مقالے کی ضخامت سے مرعوب ہو جاتے ہیں،اس لئے بھرتی کے مال کے ذریعے یہ چکا چوند پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تحقیق میں شاعرانہ اسلوب تحقیق کی خامی سمجھی جاتی ہے لیکن کیا کیجئے کہ چھٹتی نہیں یہ کافر منہ سے لگی ہوئی۔ہم مشرقی لوگ خطابت،تکرارِ لفظی اور اسمائے صفات کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں مثلاً عام زندگی

میں ''لال سُرخ''، '' پیلا زرد'' اور اسی طرح دوہری صفات استعمال کرتے ہیں۔ تحقیق میں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ انشا پردازی، رنگیں بیانی، ناصحانہ اور جذباتی اندازِ بیان شایانِ تحقیق نہیں۔

تحقیق میں جدید ذرائع کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ مثلاً جن کتب اور رسائل کے لئے متلاشیانِ علم کتابوں کی دکانوں اور لائبریریوں کی خاک چھانتے تھے، وہ اب آن لائن اور ایک دو کلک کے فاصلے پر موجود ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف سرچ انجن مثلاً گوگل، یاہو، وکی پیڈیا، ایمازون اور فیس بک ہمیں گھر بیٹھے ہزاروں معلومات مہیا کر رہے ہیں۔ شرط یہ کہ آپ کے موبائل میں بیلنس اور وائی فائی کا کنکشن موجود ہو۔

سندی تحقیق اور عمومی تحقیق کے لئے ہائر ایجوکیشن کمشن آف پاکستان (HEC) کی طرف سے جے سٹور (J Store) پر ہزاروں کتب اور معیاری رسائل مہیا کردئے گئے ہیں۔ اسی طرح گوگل سکالر ہمیں گھر بیٹھے لاکھوں کتب اور رسائل پیش کر رہا ہے۔ صرف ایک archive.org کی ویب سائٹ پر، علوم اسلامیہ کے حوالے سے ایک کروڑ چالیس لاکھ کتب موجود ہیں۔ تحقیق کا یہ انوکھا زاویہ موجودہ محققین کے لئے ساتوں در کھولتا ہے۔ یہاں کُھل جا سم سم سے صدیوں کے بند دروازے کھلتے ہیں۔ ایک ایسی کتاب جس کے لئے محقق کو سال ہا سال کے دُکھ بھوگنے پڑتے تھے، اب چند سیکنڈ میں پی ڈی ایف یا کسی اور شکل میں آپ کے کمپیوٹر کی سکرین پر موجود ہوتی ہے۔ یہ ناقابلِ یقین بل کہ ہوش ربا حقائق موجود محققین کے لئے راہِ تحقیق کو فرشِ مخمل بنا رہے ہیں۔ لالہ وگل سے سجی، وادیٔ تحقیق نئے راہروں کو خوش آمدید کہتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

۱۔ مختا احمد عزمی۔ سلیم احمد شخصیت اور فن۔ اکادمی ادبیاتِ پاکستان۔ اسلام آباد ص ۹۔ ۲۰۰۹ء

یوں تو پی ایچ ڈی کے دوران میں جادۂ تحقیق سے آشنائی ہوئی لیکن لگتا ہے کہ '' مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا''۔ والدگرامی (اللہ کریم اُن کے درجات بلند فرمائے) کنوئیں تعمیر کرتے تھے۔ اُن کا یہ عمل یعنی مٹی کو بہت گہرا کھود کر پانی نکالنا بھی ایک مفیدِ خلائق تحقیقی عمل ہی تھا۔ ہمارے دیہاتوں میں کچھ سیانے لوگ یا کھوجی، چوروں کا پیچھا کرتے ہوئے، اُن کے پاؤں کے نشانات (پنجابی زبان میں ''کھرا'' کہتے ہیں) کے ذریعے چوروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ابا جی مرحوم بھی ایک ماہر کھوجی تھے۔ یہ بھی ایک طرح کا تحقیقی عمل ہی ہے۔ اب آگے میری بیٹی بھی اپنے طبی تحقیقی مضامین ایچ ای سی کے تحقیقی مجلات میں شائع کروا چکی ہے۔ اس طرح گویا میری تین نسلیں کسی نہ کسی حوالے سے، تحقیق کی وادی میں ہیں۔ یہ حسرت اور دعا ہے کہ کاش ہم اس میدان میں کوئی کارنمایاں کر سکیں۔

۲۔ رضوی، سید جمیل احمد، لائبریری سائنس اور اصولِ تحقیق، ص ۱۴

۳۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، مرتب اردو میں اصولِ تحقیق ص ۲۷

۴۔ خان، رشید حسن، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، الفیصل ناشران، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰

۵۔ قادر، ہارون، ڈاکٹر، ابجد تحقیق۔ الوقار پبلیکیشنز، واپڈا ٹاؤن لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۲۸

۶۔ امجد علی شاکر، تحقیق و تدوین، عکس پبلیکیشنز بک سٹریٹ، داتا دربار مارکیٹ لاہور ۲۰۱۸ء، ص ۲۸

۷۔ خالد رشید تعلیمی تحقیق

۸۔ گارسیں دتاسی، تاریخ ادبیات اردو، ترجمہ: لیلیان سیکسن نازو، ص ۶۸، ۴۷

۹۔ امجد علی شاکر، تحقیق و تدوین اصول و مبادی، عکس پبلشرز، داتا دربار مارکیٹ، 2018، ص ۴۶

۱۰۔ راقم کا پی ایچ ڈی کا زبانی امتحان ڈاکٹر جمیل جالبی مرحوم نے ۱۹۹۴ء میں لیا تھا۔

۱۱۔ عطاء اللہ، محمد ڈاکٹر، 2016، طرزِ تحقیق، لاہور، رائٹرز فاؤنڈیشن، علامہ اقبال ٹاؤن، ص ۱۳

۱۲۔ جین، گیان چند، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۰۲ء ص ۹۵

۱۳۔ ایضاً ص ۳۳۴

۱۴۔ عطاء اللہ، محمد ڈاکٹر، 2016، طرزِ تحقیق، لاہور، رائٹرز فاؤنڈیشن، علامہ اقبال ٹاؤن، ص 142

۱۵۔ شاکر، امجد علی، تحقیق و تدوین اصول و مبادی، عکس پبلشرز، داتا دربار مارکیٹ، 2018، ص ۱۳۸

۱۶۔ جین، گیان چند، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۰۲ء ص ۲۷

۱۷۔ خان، رشید حسن، ادبی تحقیق مسایل اور تجزیہ، الفیصل ناشران اردو بازار لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۱

مہاجر پرندے......ہجرت کا شعری استعارہ

نوید مرزا/لاہور

مہاجر پرندے معروف شاعر ظفر اعوان کا تازہ شعری مجموعہ ہے ظفر اعوان اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ شہرِ اقبال سیالکوٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل ملازمت کے سلسلے میں ڈنمارک میں قیام پذیر ہیں۔ وطن سے دوری نے ان کے اندر ہجرت کے ایک ایسے کرب کو نمایاں کیا ہے جو تخلیقی صورت میں ڈھل کر ''مہاجر پرندے'' کی کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ شاعر نے پرندوں کو علامت بنا کر ہجرت اور اپنی مٹی کی مہک سے دوری کو شعری زبان میں خوبصورت انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ آیئے اس کی چند مثالیں دیکھتے ہیں:

جو ہو ہو کی آواز آتی ہے چھت سے
خدائے سخن کے ہیں ذاکر پرندے

....

وہ دکھ ہجرتوں کے نہیں جانتا ہے
کہ مارے ہیں جس نے مہاجر پرندے

....

زمیں ہو گئی تنگ تیری خدایا
ہواؤں میں سوئے مہاجر پرندے

اس ساری کیفیت کو کتاب کے دیباچے میں جناب اظہر فراغ نے یوں محسوس کیا ہے۔ ''مہاجر ہونا ہی کم دکھ نہیں اور اس پر پرندوں کی ہجرت، معنی آفرینی کا نیا دروازہ کھولتی ہے اور اگر اس کو ظفر اعوان کے لب و لہجے کے تناظر میں دیکھئے تو ہجرت کی آسائشوں میں چھپی اذیت بڑی شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے۔''

ظفر اعوان کی شاعری میں محبت کے رنگ نمایاں ہیں۔ محبتوں کے سحر نے انہیں زیادہ شدت سے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ ان کے زیرِ تبصرہ مجموعے ''مہاجر پرندے'' میں بہت سے اشعار محبت اور اُس سے وابستہ کہانیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی محبت عامیانہ نہیں بلکہ وہ اپنے شعری اظہار میں زلف و رُخسار اور گل و بلبل کے موضوعات کی بجائے نت نئے تجربات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آیئے چند اشعار دیکھتے ہیں:

میں نے دو پل کا وصل مانا تھا
اُس نے کی چھان بین برسوں سے

....

عاشقوں نے اُلفت میں جتنی خاک چھانی ہے
خاک گر نہیں ہوتی خاکسار کیا کرتے

....

اُسے کہنا کہ اب مہندی لگائے
مرے ہاتھوں کا چھالا جا چکا ہے

لیکن محبتوں کو اپنی زندگی سمجھنے والا شاعر زمینی حقائق سے بھی بے خبر نہیں۔ ''مہاجر پرندے'' کے شاعر ظفر اعوان عصری مسائل، معاشرے میں ہونے والی تلخیوں اور معاشرتی ناہمواریوں پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ظفر کی شاعری میں بے ساختگی، سہل پسندی اور روانی ہے۔ اسلوب خوبصورت اور متاثر کن ہے۔ بقول جمیل احسن ''ان کی غزلیں پڑھ کر ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کسی بیرونی دستور العمل کے طابع ہیں۔ اپنے گہرے سماجی اور معاشرتی رابطوں کے باوجود ظفر کی شاعری کا واضح بیان ان کی طبیعت کا پرتو ہے۔ جس میں ان کی بے ساختگی میں ہلکا پھلکا طنز اور تخلیقی شخصیت کا عکس جھلکتا ہے۔''

''مہاجر پرندے'' میں اور بھی کئی شعراء و ادباء کی رائے ہے جنہوں نے شاعر کے اوصاف کو بھرپور انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ میری طرف سے ظفر اعوان کو ان کے تازہ شعری مجموعے پر مبارک اور دُعائیں۔ چند شعر اور ملاحظہ کریں اور مجھے اجازت دیں۔

ہم کو لوٹا خدا کے بندوں نے
ہم خدا کی رضا سمجھ بیٹھے

....

بھوک کی ہتھیلی پر چھالے گن نہیں پائے
آسماں کے تاروں کو ہم شمار کیا کرتے

....

سال پورا ہی رکھتے ہیں روزے
دیکھ لو حوصلہ غریبوں کا

....

جس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے
اپنا کیوں اس کا گھر نہیں ہوتا

....

آپ کو شوق شہرتوں کا ہے
میرا سب کچھ ہے شاعری میری

شاعری کو اپنا سب کچھ سمجھنے والے ظفر اعوان کو آج کی اس تقریب کے انعقاد پر ڈھیروں مبارک باد۔ سلامت رہیں......Well done

'میرا گریباں چاک' پڑھ کر

ظفر احمد چودھری

جنوری کے شمارے میں مکرم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی کتاب ''میرا گریباں چاک'' پر ایک تبصرہ پڑھنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ میں نے بھی اس کتاب کے چھپنے کے بعد ایک تبصرہ لکھا تھا اور اُسے فاضل مصنف کو سنایا۔ انہوں نے فرمایا کہ اسے ضرور چھپوائیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے یہ تبصرہ اظہر جاوید صاحب کے رسالہ ''تخلیق'' کو بھجوا دیا جو غالباً چھپ بھی گیا تھا۔ اس تبصرے کا ایک حصہ ''الحمرا'' کو ارسال ہے جو اگر مناسب ہو تو شائع کر دیا جائے۔

جاوید اقبال صاحب نے کتاب کے آخر میں اپنے والد سے چند سوالات کیے ہیں۔ میں نے ان سوالات کے علامہ کی طرف سے ممکنہ جواب کی طرف اشارہ کرنے کی جسارت کی ہے۔

جانِ پدر۔ سلامت باشد

تمہاری چاکِ گریبان کی داستان میں نے دیکھی ہے۔ مجھ تک اس لیے پہنچی کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

تم نے کچھ یہ بھی گلہ کیا ہے کہ میں نے تم سے اپنی محبت کا کبھی کھل کر اظہار نہ کیا۔ اپنی یہ کوتاہی مجھے قبول ہے اور میں یہاں اس کی تلافی کی بھی کوشش کرتا رہتا ہوں:

گرچہ دُوریم بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نبود در سفرِ روحانی

ہاں تمہارا دوسرا خط بھی ملا جس میں تم نے کچھ سوالات اُٹھائے ہیں اور میرے مؤقف کی وضاحت چاہی ہے۔ تمہارے پہلے خط میں ایک گراموفون کا مطالبہ تھا جو میں پورا نہ کر سکا۔ اسی طرح دوسرے خط کا مطالبہ بھی کلیتاً تو پورا نہ ہو سکے گا۔ البتہ میں کچھ باتیں اس ضمن میں ضرور کہوں گا۔ گو مجھے علم ہے کہ یہ بہت سے لوگوں کو گراں گزریں گی لیکن اس خوف سے حق اور بے باکی سے کنارہ کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

میں ایک شاعر اور مفکر تھا اور جیسا کہ تم نے بیان کیا ہے عمل کی راہ پر متواتر گامزن ہونا میری اُفتاد سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ لیکن شاید میری کاہلی میرے فکر اور تجسس میں کچھ ممد بھی ہوئی ہو۔ خیر یہ تو اب ہو چکا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ وقت، ماحول اور عمر کے ساتھ ساتھ میرے خیالات اور رویّوں میں تبدیلی ہوتی رہی۔ میں نے آبِ رودِ گنگا کے بھی گیت گائے، بدیشی حاکموں کا قصیدہ بھی لکھا، پنجاب کی یونین اسٹ پارٹی کا فرد بھی رہا، مسولینی اور سٹالن کی مدح سرائی بھی کی، اپنی آزاد طبیعت کے زیر اثر کچھ برگشتہ بھی ہوا، لیکن بااین ہمہ میری رُوح ہمیشہ بادۂ توحید سے مخمور اور حُبِّ رسولؐ سے منوّر رہی اور میں نے اسی کو حقیقی صراطِ مستقیم جانا لیکن یہ سراسر ستم ظریفی ہے کہ مجھ کمزور اور آزاد خیال کو خوش عقیدت اور خود غرض لوگوں نے حکیم الامت کہنا شروع کر دیا اور رحمۃ اللہ علیہ کا درجہ دیا۔ اس غلو پر مجھے امیر مینائی کا شعر یاد آتا ہے:

امیر اس خرقہ و عمامہ کو تم رہنِ مے کر دو
ابھی سجتا نہیں تم پر یہ جبہ پارسائی کا

آپ کے شکوک اور استفسار کا حتمی جواب دینا میرے لیے قدرے مشکل ہے۔ یہ اس لیے کہ میں اس رائے پر ہمیشہ قائم رہا کہ بدلتے ہوئے حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ مروجہ اصولوں اور قوانین کا جائزہ لازم ہے اور یہ عمل جاری رہنا چاہیے۔ اگر یہ کون و مکان ابھی نامکمل ہیں اور کن فیکون کا عمل جاری ہے تو ہماری سوچ کیوں کر مکمل ہو سکتی ہے؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ اجتہاد وہ لوگ کریں جو دین اور جدید علوم سے بخوبی واقف ہوں اور نیا راستہ تعین کرنے کی ہمت اور جرأت بھی رکھتے ہوں۔ یعنی کہ فکر و تدبیر و جہاد کی راہ پر گامزن ہوں۔ مادی دنیا چھوڑے ہوئے مجھے 70 سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ میں تو کبھی ہوائی جہاز میں بھی نہ بیٹھا تھا اور اب انسان نہ صرف چاند پر قدم رکھ چکا ہے بلکہ سیاروں تلک پہنچنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ میں نے کوئی ایسا غلط نہیں کہا تھا کہ:

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
زمیں اور بھی آسماں اور بھی ہیں

اب جب آپ لوگ اس بدلی ہوئی دنیا کے باسی ہیں تو کئی ایک اصولوں اور قوانین وغیرہ کو دوبارہ پرکھنا ہوگا اور موجودہ ماحول کے مطابق ان کی از سرِ نو تشریح کرنا ہوگی۔ اخلاق اور کردار کی اقدار تو ابدی ہو سکتی ہیں لیکن سماجی، معاشی اور صنعتی تبدیلیوں کے ساتھ رہن سہن اور قوانین کی تبدیلی بھی ناگزیر ہے۔

جو کچھ میں نے اپنی زمینی زندگی کے دوران کہا اور لکھا تھا اُمید کرتا ہوں وہ آپ کے لیے مددگار ثابت ہوگا لیکن اسے حرفِ آخر نہ سمجھیں اور سابقہ تشریحات کو سامنے رکھ کر اُس راستے کا تعین کریں جو موجودہ ماحول کے مطابق صحیح ہو۔ تاہم چند ایک نکات بیان کر دیتا ہوں۔

جیسا کہ آپ سب کو علم ہے میں نے ترکی کے انقلاب کا خیر مقدم کیا جس نے ایک فرسودہ اور جامد خلافت کا خاتمہ کیا۔ یہ اس لیے کہ میری دانست میں وہی نظامِ حکومت اسلام کی روح سے مطابقت رکھتا ہے جس میں عوام الناس کی رائے شامل ہو اور جس میں بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قوانین میں ترمیم یعنی اجتہاد بھی جاری رہ سکے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ قحط کی صورتِ حال کے سبب حضرت عمر نے خوراک کی چوری کو عام چوری سے کم درجے کا جرم قرار دیا اور وہ سزا موقوف کر دی جو چوری کے جرم کے لیے قرآن حکیم میں مذکور ہے۔ اس مثال سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں عام قوانین میں ترمیم نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ اس لیے ربا کے معاملے کا بھی ہمیں سنجیدگی سے ازسرِنو جائزہ لینا چاہیے کہ جو ربا منع کیا گیا اُس کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ معاشی لین دین میں بہت سی نئی صورتیں پیدا ہوئی ہیں اور ہر قسم کے اضافے یعنی Interest کو آنکھیں بند کر کے ربا ٹھہرانا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ جہاں کسی ضرورت مند کی مجبوری اور ناداری سے فائدہ نہ اُٹھایا جاتا ہو یعنی استحصال یا Exploitation کا عنصر موجود نہ ہو تو اس کاروبار کو ناجائز ٹھہرانا صحیح نہ ہوگا۔ ہاں مجھے مولانا شبلی کے اس مؤقف سے اتفاق ہے کہ بنکوں کے لین دین میں جو سود یعنی Interest شامل ہوتا ہے وہ ربا نہیں کہا جا سکتا اور اس لیے ناجائز نہیں۔ ایسے لین دین سے تو دولت گردش کرتی ہے اور معاشی ترقی ہوتی ہے جو اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کے تمام مسلمان ملّتِ اسلامیہ میں شامل ہیں۔ پہلے زمانے میں لوگ عام طور پر قبیلوں کی شکل میں بٹے ہوئے تھے لیکن آہستہ آہستہ ملک یا Nation State کا ڈھانچہ نمودار ہوا اور دنیا مختلف ممالک کی صورت اختیار کر گئی۔ اس طرح ملّتِ اسلامیہ میں کئی ممالک نمودار ہوئے اور ملک ہی قومیت کا نشان سمجھا گیا۔ یہ ایک ارتقا ہے جس سے ہم صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مختلف اسلامی ممالک میں یکساں نظامِ حکومت رائج نہیں اور ان کی روایات، طرزِ حکومت اور قوانین میں خاصا فرق ہے۔ میری نظر میں ایک اسلامی ملک میں عوام کی رائے کا استصواب، حقوقِ انسانی کا تحفظ اور متفقہ قانون کی بالادستی ازحد ضروری ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی لازم ہے کہ اسلامی ممالک میں رہنے والے غیر مسلموں کو پوری مذہبی آزادی اور ہر قسم کے برابر حقوق حاصل ہوں۔

الا ماشاء اللہ ہمارے علما کی سوچ اور حالت اسلام کی رُوح اور دورِ حاضر کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ میرا نام تو لیتے ہیں لیکن وہ اپنے اپنے مسلک کے اسیر اور لکیر کے فقیر ہیں اور حقیقی اجتہاد کے مخالف ہیں۔ ان کے اپنے اخلاق اور کردار کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس کی چند ایک مثالیں تم نے اپنی کتاب میں شامل کر دی ہیں۔

تمہاری طرح میرا دل بھی زخمی ہے کہ پاکستان ابھی تک ویسا ملک نہیں بن سکا جیسا کہ چاہیے تھا اور جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ہمت، فطانت، دور اندیشی اور لگن سے خواب حقیقت تو بن گیا لیکن اسے مناسب قیادت نہ ملی اور اس نے ویسی ترقی نہ کی جیسی کہ تمہارے اردگرد بہت سے ملکوں نے کی۔ حالانکہ انھیں اسلام کے منور چراغ کی روشنی بھی میسر نہ تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ خود احتسابی کے عمل سے گزریں۔ اپنے قول و فعل کے تضاد کو دور کریں۔ اپنے مسلک کا اتباع ضرور کریں لیکن برداشت اور رواداری کے ساتھ جدید تعلیم حاصل کریں۔ معاشی اور صنعتی ترقی کریں اور صحیح معنوں میں ایسی طاقت حاصل کریں کہ دوسروں کے دست نگر نہ رہیں۔ تمہارے معاشرے میں ایسا عدل اور انصاف ہو کہ دوسرے اس کی تقلید کریں۔ ہر انسان کی بنیادی ضروریات پوری کریں اور بلا تفریق و امتیاز ہر ایک کو عزت کی نظر سے دیکھیں اور اُس سے عدل و احسان کا سلوک کریں:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

قولِ فیصل کے بارے میں

ڈاکٹر اختر شمار/ ڈاکٹر طاہر شہیر

فیصل کمال حیدری ہمارے ایف سی کالج لاہور کے ابتدائی رفیقانِ شعبہ اردو میں شامل رہے۔ چند برس بعد اگرچہ وہ محکمہ تعلیم پنجاب سے وابستہ ہو گئے مگر ان سے تعلقِ خاطر میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اب تو وہ ماشاءاللہ ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں اور جادۂ تحقیق کے مسافروں کے لیے شجرِ سایہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بصارت سے محروم ہونے کے باوجود بھی انھوں نے اپنے آپ کو لاچار، بے بس یا دوسروں کے رحم و کرم پر کبھی نہیں رکھا۔ ان کی بصیرت، علمی اور تخلیقی توانائی نے انھیں قدم قدم پر کامرانیوں سے سرفراز کیا۔

فیصل کمال ایک ذہین، محنتی اور صاحب مطالعہ استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ تخلیقی صلاحتیں رکھنے والے شاعر بھی ہیں۔ اس کا اندازہ ان کا شعری مجموعہ دیکھ کر بھی ہوتا ہے۔

ان کی غزلیں نظمیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ آج کے کئی مقبول نوجوان شعراء سے کہیں زیادہ توانا شاعر ہیں۔ ان کی غزل کبھی اکیسویں صدی کے انسان کا کرب اور نوحہ محسوس ہوتا ہے اور کبھی ہندی الفاظ وتراکیب کی کہکشاں کے ساتھ، فطرت کی قصیدہ خواں لگتی ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں باطنی احساسات وجذبات اور اساطیریت کے گندھے ہوئے رنگ قاری کے دل پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔

فکری اعتبار سے جہاں ان کی شاعری میں متصوفانہ شعور کی جھلکیاں ملتی ہیں وہیں اسلوبیاتی سطح پر ان کے ہاں روایتی شعری سانچوں، رویوں اور قیود سے انحراف بھی نمایاں ہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ شوقِ جدّت میں محض چونکا دینے والے شعر کہتے ہیں بلکہ ان کے ہاں خیال آرائی، مستقبل بینی، داستاں طرازی، وسعتِ خیال اور رعنائیِ خیال کی بوقلمونی بھی جگمگاتی نظر آتی ہے۔

بغیر کسی انتخاب کے ان کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

وہ انبساط سے آگے نکلنے والا تھا
دم حیات سے آگے نکلنے والا تھا

......

یہ تعلق آخری سانسوں میں ہے، میں نے کہا
اور پھر اٹھتے ہوئے اس نے کہا تھا "کیا پتا"

......

آنکھ جھروکوں پر کیوں جگنو آ ٹھہرے
بول دُلاری! دل کا آنگن کیسا ہے؟

......

وہ اپنا چاند تھا حُسنِ جہاں میں
مجھے اِک استعارہ چاہیے تھا
مجھے کثرت میں وحدت ڈھونڈنا تھی
مجھے وہ پارہ پارہ چاہیے تھا

......

دفعتاً کچھ سوچ کر ہنسنے لگے
بے سبب پھر کھلکھلا کر رو پڑے

فیصل کا مجھ سے پہلا تعارف ایم اے اردو کے رزلٹ والے دن ہوا۔ میں نے گورنمنٹ کالج میں ٹاپ کیا تھا اور پتا چلا کہ فیصل کمال نامی کوئی لڑکا ہے جس نے ایف سی کالج میں پہلی اور پنجاب یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن لی ہے۔ اس کے بعد یہ نام دوسری بار میرے سامنے اس وقت آیا جب میں نے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا۔ یہاں بھی فیصل مجھ سے ایک نمبر آگے تھا۔ میری پوسٹنگ لاہور سے باہر ہوئی اور میں نے جوائننگ دینا مناسب نہ سمجھا۔ لہذا تیسری بار یہ نام اس وقت میرے سامنے آیا جب میں نے ایف سی کالج میں انٹرویو دیا اور سلیکٹ ہونے والوں کی لسٹ میں یہ نام میرے نام سے اوپر تھا۔ یعنی فیصل بھی لاہور چھوڑنے کو تیار نہ ہوا تھا اور یوں ہم کولیگز بن گئے۔ فیصل سے پہلی ملاقات سٹاف روم میں ہوئی اور اس کے بعد تعلق کا ایک ایسا رشتہ استوار ہوا جو دوستی میں تبدیل ہوا اور وقت کے ساتھ مزید مضبوط ہوتا چلا گیا۔ فیصل ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا انچارج تھا اور اس کا کمرہ میرے لئے گوشہ عافیت تھا۔ وہاں بیٹھ کے ہم چائے پیتے، گانے سنتے، گپیں لگاتے۔ فیصل اپنی شاعری سناتا، میں اس کے شعروں کی ٹانگیں توڑتا، انکی پیروڈی کرتا۔ پھر ایک روز شطرنج پہ بات ہوئی تو میں نے بتایا کہ میرا تو ایک زمانے سے یہی مشغلہ ہے۔ فیصل کہنے لگا کہ پھر ہو جائے ایک بازی۔

یہ جملہ میرے لئے چونکا دینے والا تھا کیونکہ فیصل بصارت سے محروم تھا۔ باقی معاملات میں اس کی صلاحیتوں کا معترف تو میں تھا ہی لیکن یہاں اس نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈالنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ خیر ہم نے بازی لگائی تو تین یا چار منٹ میں نوبت چیک پہ آ گئی تھی اور میں چاروں شانے چت تھا۔ فیصل کو قدرت نے جہاں ظاہری طور پر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم رکھا ہے وہاں اس کے باطن کو اس حد تک روشن کر دیا ہے کہ وہ ہزار آنکھیں رکھنے والا شخص بن چکا ہے۔ اس کی شاعری ان ہزار آنکھوں میں سے ایک آنکھ ہے جس سے وہ اس معاشرے کو دیکھتا اور ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔ فیصل عام زندگی میں جس حد تک شفاف، واضح، دوٹوک انداز میں بات کہنے کا عادی ہے، اسکی شاعری میں بھی یہی جھلک نمایاں ہے۔

فیصل کی شاعری اُداس راتوں میں سگریٹ کے دھویں پہ تیرتے جذبوں کی شاعری ہے۔ فیصل لفظوں کے گچھے بناتا ہے اور یہ ذہن کی فضا پہ گول گول چکر لگاتے دل کے نہاں خانوں میں تحلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

فیصل کی شاعری میں وہ تمام رنگ، موسم، رُتیں، دور، شامیں، گرمیوں کی دوپہریں، پُرانے خط، جواں جذبوں کے خواب، زندگی کی تشنہ لبی اور حقیقت سے سراب تک کی وہ تمام راہداریاں موجود ہیں جو اسے عام روایتی شاعروں سے بہت منفرد اور ممتاز کر دیتی ہیں۔ فیصل کے شعر جذبے کی حدت اور شدت سے تمتماتے ہوئے اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ شعری مجموعہ اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

Beyond Beat

آغا گل

میرے بابا محمد اکبر خان نہایت ہی ایمان دار افسر تھے۔ اکثر کہا کرتے کہ ہندوستان میں نماز پر کیا پابندی تھی یہ ملک تو اسلام کی سربلندی اور اعلیٰ قدروں کے لیے قائم کیا ہے۔ وہ کنٹرولر امتحانات ہوئے تو محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر اور دیگر افسروں کے بیٹے امتحان میں فیل ہو گئے۔ حالانکہ انہوں نے بابا پر خاصہ دباؤ رکھا کہ ان کے بیٹوں کو اعلیٰ نمبروں سے پاس کرنے کے علاوہ اول دوئم پوزیشن بھی دی جائے۔ انہوں نے بابا کو تو کیا مجھے سزا دینے کا انوکھا طریقہ سوچا۔ میرے بابا کو ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز فورٹ سنڈیمن اور لورالائی اضلاع لگا دیا گیا۔ ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول ژوب کا چارج بھی ان ہی کے سپرد کر دیا تا کہ وہیں پابند ہو کے رہ جائیں۔ میں بہت مچلا۔ بہت ضد کی مگر وہ نہ رُکے۔ اُن کے جاتے ہی ایمانداری کی چڑیل ہمارے گھر پہ مسلط ہو گئی۔ گھر بالکل اُداس اور سونا سونا رہنے لگا۔ ان کے خط کے انتظار میں روزانہ میں گھر کے باہر تھڑے پہ آ بیٹھتا۔ ان دنوں میں پکی جماعت میں تھا۔ جہاں بچوں کی حاضری بھی نہ لگتی اور گیارہ بجے کے قریب انہیں چھٹی دے دی جاتی۔ باقی بچے تو اپنے بڑے بھائیوں کی جماعتوں کے باہر انتظار میں بیٹھتے۔ چونکہ میرا گھر پہلو میں ہی تھا میں گھر چلا آتا۔

حالات کے تحت میری زندگی کا سب سے اہم شخص ڈاکیا بن گیا۔ وہ روزانہ خاکی وردی ڈانٹے ہماری سڑک پہ آتا۔ زور زور سے سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے پکارتا ”پوسٹ مین۔ پوسٹ مین“ دبلا پتلا مگر چاک و چوبند سا انسان تھا۔ بڑا ہی پھرتیلا تھا۔ ڈاک بانٹ یہ جا وہ جا نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ پہلی بار وہ بابا کا خط لایا تو میں نے خوشی میں اسے ایک اکنی دی جس پہ وہ مسکرایا اور اگلے ہی روز میرے لیے دو آنے کا ڈاک لفافہ لیتا آیا کہ اس میں جو خط میں ڈالوں گا وہ میرے بابا تک پہنچ جائے گا۔ میں نے اپنی بہن ظاہرہ گل سے خط لکھوایا۔ اس پر چند لفظ میں نے بھی لکھے اور اگلے ہی روز ڈاکیے کے حوالے کر دیا۔ یوں ہماری دوستی ہو گئی۔

بابا اپنی تنخواہ ہمارے ہاں منی آرڈر کر دیا کرتے۔ ایسا منی آرڈر بھی ڈاکیا ہی لاتا۔ اماں اسے میرے ہاتھوں چائے کا کپ بھی بھجوانے لگیں۔ ہر ماہ منی آرڈر وصول کر کے ڈاکیے کو ایک روپیہ بھی دیا جاتا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ شاید پیچھے ہٹتا رہا یا آگے بڑھتا رہا۔ مجھے کبھی پتہ نہ چلا۔ بابا بھی محبتیں بکھیرنے کے لیے آتے جاتے رہے۔ پھر چند برس بعد ان کی تبدیلی سیوی ہو گئی۔ ڈاکیا کا کاتب بھی مجھے عزیز رہا اور جب میں فرسٹ ایئر میں تھا تو ایک روز اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی چلا آیا۔ ڈاکیے نے اماں کو دروازے پر بلوایا۔

اماں کیواڑ کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ یہیں وہ منی آرڈر یا وی پی وصول کرنے آیا کرتی۔ ڈاکیا کا کا ہمیں الوداع کہنے آیا تھا۔

”بہن! کل سے میں ریٹائر ہو رہا ہوں۔ یہ نوجوان ہے فضل دین۔ اچھا لڑکا ہے۔ اب یہ آپ کی Beat کا پوسٹ مین ہوگا۔ میں نے اسے سب سمجھا دیا ہے۔“

اماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ کیواڑ کی آڑ سے اس نے پانچ روپے کا نوٹ پیش کیا جسے قدرے جھجکتے ہوئے ڈاکیے نے قبول کر لیا۔ مجھے بہت دُکھ پہنچا۔ ایسے ہی بس دل پہ گھونسا سا پڑا۔ میرا جی چاہا اسے روک لوں۔ مگر میں تو بابا کو بھی نہ روک پایا تھا۔ ڈاکیے نے گرم جوشی سے معانقہ اور مصافحہ کیا۔

”بیٹا! دل لگا کر پڑھنا۔ میں تمہیں بڑا افسر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

فضل دین نے میرا چہرہ سوگوار ہوتے دیکھا تو قہقہہ لگایا ”میں تمہارا خیال رکھوں گا یار۔ پریشان نہ ہونا۔“

ڈاکیے کا چہرہ کملایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیل پھیل جاتی۔ مگر میں اس کے قدم نہ روک پایا۔ چند ہی ماہ میں فضل مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ ان دنوں قلمی دوست بنانے کا مشغلہ تھا۔ لڑکیوں سے خط و کتابت کا اپنا لطف تھا۔ فضل میرا رازداں بن گیا۔ باقی ڈاک تو حوالے کر جاتا۔ میرا خط کسی کو نہ دیتا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر میرے ہی حوالے کیا کرتا۔

وقت دریائے نیجی کی مانند خاموش، بلا آواز، غیر محسوس طور پر بہے جاتا ہے۔ بابا کی تبدیلی قلات ڈویژن میں ہو گئی۔ ون یونٹ کے سبب بلوچستان کے دو ڈویژن تھے۔ کوئٹہ ڈویژن اور قلات ڈویژن جس کا صدر مقام مستونگ تھا۔ ہر پندرھواڑے ملیشیا کے اسکورٹ میں افسر خضدار پہنچتے۔ کچھ دفتری کام نپٹاتے

اور پھر اگلے ہی روز بہ خیریت واپسی کی دُعائیں مانگتے مستونگ لوٹتے۔ مغربی پاکستان کا دارالخلافہ لاہور تھا۔ اہل بلوچستان پنجابی بیوروکریسی سے نالاں رہتے۔ مستونگ میں بابا کو جیپ بھی مل گئی۔ یوں بھی مستونگ کچھ دور نہ تھا کوئٹہ سے گھنٹہ بھر کا سفر تھا۔

کہتے ہیں کوئٹہ 1935ء میں تباہ ہوا اور اپنا شہر تعمیر ہوا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ ہر دس برس میں شہر بدل جاتے ہیں۔ نئے انداز، نئی صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ روحِ عصر Zeitgeist تبدیلی پر مصر رہتی ہے۔ شیواء کا ہمالیہ پہ دھمال جاری رہتا ہے۔ نت نئی تبدیلیاں جاری رہتی ہیں۔ پرانی دُنیائیں لپٹتی رہتی ہیں اور تاریخ کے کباڑے خانے میں دھری جاتی ہیں۔ ڈاکیے کی چمکتی، بے داغ خاکی وردی پالش شدہ سیاہ بوٹ اور بابھروسہ سائیکل جانے کیا ہوئی۔ اس کی بجائے وہ کھٹارہ سی سائیکل پر آنے لگا۔ وردی کی دو جیبیں ہوا کرتی تھیں جن میں قلم اڑسا ہوتا۔ وہ قلم کان پہ آ گیا۔ ملگجے لباس میں میلا کچیلا ڈاکیا ٹوٹے چپل والا اب ڈاک بانٹتا پھرتا۔ پیڈل مارنے سے سائیکل کی ہڈیاں چیخنے لگتیں۔ کبھی اس کی چین اُتر جاتی، کبھی فضل اپنی پنکچر سائیکل کسی دکان پہ رکھوا کر پیدل ہی ڈاک بانٹنے نکل کھڑا ہوتا۔ بعض اوقات بھاری پارسل سر پہ اُٹھا لیا کرتا۔ چمڑے کا پوسٹ مین بیگ کب کا گھس گھسا کر کپڑے کے بدرنگ تھیلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

بابا بھی تبدیل ہو کر مستونگ سے کوئٹہ آ چکے تھے۔ ڈاکیا میرے لیے غیر اہم ہوتا چلا گیا۔ پھر تھیلا بھی غائب ہو گیا۔ فضل اب ڈوری میں ڈاک باندھ کر لایا کرتا۔ سائیکل کی طرح اس کی اپنی صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ پہلے پہل تو خاصہ چاک و چوبند ہوا کرتا تھا۔ اب تو آواز میں بھی طنطنہ نہ رہا۔ جب وہ ''پوسٹ مین'' کی آواز لگاتا تو عید قربان کی رات ممیانے والی بکری کی آواز ہی نکل پاتی۔ اس کی آواز میں بھی دراڑیں پڑ رہی تھیں۔

البتہ پورے علاقے میں وہ خاصا مقبول ہو چکا تھا۔ اسے شادی بیاہ کے موقعہ پر ضرور مدعو کیا جاتا۔ شادی کے کارڈ تقسیم کرنے میں بھی اس سے مدد لی جاتی۔ امیر غریب سبھی اسے عزیز رکھا کرتے۔ فضل کی خوش اخلاقی بھی شامل حال رہی۔ ذاتی تعلقات بنانے میں بھی اسے ملکہ حاصل تھا۔ کوئی ڈاک نہ بھی ہوتی تو دھڑ سے گھر کی گھنٹی بجاتا اور پکارتا ''پوسٹ مین''۔ میری والدہ کو وہ اماں جی کہا کرتا۔ ان کی خیریت دریافت کرتا۔ اماں کا عقیدہ تھا کہ اب فقیر فقراء کو کچھ دینے دلانے کا سمے نہیں رہا۔ کیونکہ گداگر تو ہر در پہ دستک دیتے ہیں۔ ہر اک کے سامنے دست سوال وا کرتے ہیں۔ جبکہ سفید پوش تو بھوکوں مر جائیں کہیں جھولی نہیں پھیلانے کے۔ اماں چپکے چپکے فضل کی مالی مدد بھی کیا کرتیں اور اسے ''فضل بیٹا'' کہہ کر مخاطب کرتیں۔ فضل پاس پڑوس تو کیا پوری Beat میں اُدھار کر لیا کرتا۔ رقم لیے بغیر ہی وی پی دے جایا کرتا۔ بعض خواتین دو قسطوں میں رقم لوٹایا کرتیں۔ بیرنگ خط کی رقم وہ ہفتہ بھر بعد وصول کرنے پہ آمادہ رہتا۔ غرضیکہ فضل ڈاکیا مجسم اخلاق تھا۔

پھر بابا مدت ملازمت پوری کر کے گھر آ بیٹھے تو اخباری کالم اور کتابیں لکھنے لگے۔ فضل اُن کے لیے ڈاک کے ٹکٹ لایا کرتا۔ ان کی رجسٹریاں بڑے ڈاک خانے سے بک کروایا کرتا جس سے ملحق ڈاک خانہ کی کالونی بھی تھی۔ فضل وہیں کہیں رہتا تھا۔ میں نے مقابلہ کا امتحان دیا تو فضل ہی میرا رول نمبر لایا اور پاس ہونے کا خط بھی فضل ہی لایا جس پر اماں نے اسے مٹھائی کے پیسے بھی دیے۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ مجھے پوسٹل گروپ ملا۔ پولیس اور انکم ٹیکس دو جعلی ڈومی سائیکل لے گئے جنہوں نے شاید نقشہ میں ہی بلوچستان دیکھا ہو۔ محکمہ ڈاک ایک Lowest priority محکمہ تھا۔ اسے ہمیشہ Tail ہی میں رکھا جاتا۔ وطن عزیز میں لکڑ ہضم پتھر ہضم آقاؤں کی لاٹھی گولی چھترول مارکہ آمدانہ حکومتیں رہیں۔ لہٰذا حاکموں نے محض ان محکموں کو پروان چڑھایا جو ان کے اقتدار کو طول بخش سکتے تھے۔ ان میں گنگو اتیلی کی بھلا کیا اہمیت و ضرورت! ایاز قدر خود بہ شناس۔ کیونکہ Beggars can not be choosers مجھے محکمہ ڈاک قبول کرتے ہی بن پڑی۔ میرا گھرانا مخالف تھا کہ زنان خانہ، پاگل خانہ مال خانہ جیسے محکموں میں جانے سے بیکاری ہی بھلی۔ مگر میں نے قدرت کا فیصلہ اور مقدر سمجھ کر سر جھکا دیا۔ فضل البتہ بہت ہی خوش ہوا۔ تربیت کے بعد میری کوئٹہ ہی تعیناتی ہو گئی۔ کیونکہ قیام پاکستان تو کیا جب 1876ء میں برٹش پوسٹل نظام آیا برٹش بلوچستان میں اور محکمہ ڈاک قائم ہوا تب سے میں بلوچستان کا پہلا افسر تھا۔ میں نے فضل سے ویسے ہی برادرانہ مراسم رکھے۔ چند بار اسے پیش کش بھی کی کہ اسے ہیڈ پوسٹ مین بنائے دیتا ہوں۔ مگر اسے ہماری Beat اور اس کے باسیوں سے کچھ ایسی مودت تھی کہ اس کا جینا دشوار ہو جاتا۔ کبھی اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ کسی کا بیٹا کسی کا بھائی کسی کا انکل تھا۔ غرضیکہ وہ ترقی لے کر اتنے رشتوں کا خون نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ پورا علاقہ تہواروں

پر اور موقعہ بہ موقعہ اسے رقم دیا کرتا جس کے باعث اس کی بہ آسانی گزر بسر ہو رہی تھی۔ میں نے اسے کلرک بنانے کا بھی عندیہ دیا کہ فضل بھائی کہاں مارا مار دھوپ میں اور کبھی برف میں ڈاکٹر بانٹتے پھرتے ہو۔ گھر سے نکل کر بڑے ڈاک خانے آ جانا اور مزے سے گھر جانا۔ مگر اسے توBeat کا ایسا چسکا تھا کہ ہنس کر ٹال دیتا۔ اماں کے کان میں بھنک پڑی تو مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''خبردار! میرا ڈاکیا نہ بدلنا۔''

محکمہ نے کچھ Delivery Beats کو Upgrade کیا۔ چیف پوسٹ ماسٹر نے ہماری Beat کو بھی بلا کہے Upgrade کر دیا۔ میں نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا کہ اس نے ایسی فرمان برداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ گھر جو پہنچا تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ کیونکہ فضل ڈاکیا تبدیل ہو چکا تھا۔ اماں کو یقین دلایا کہ کل تک وہ واپس آ جائے گا تب وہ میری شکل دیکھنے پہ راضی ہوئی۔ میں نے نہایت ہی ندامت سے Beat کو دوبارہ Down grade کروادیا۔

اپنی ریٹائرمنٹ سے ایک ہفتہ قبل بھی فضل نے جانے کیا جادو چلایا کہ اماں نے اعلانِ جنگ کر دیا کہ اگر فضل اُن کے گھر ڈاک نہ لایا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گی۔

انہیں یہ بھی ملال تھا کہ میں فضل کو نئی وردی اور نئی موٹر سائیکل کیوں نہیں دلواتا۔ بابا کی جنریشن پاکستان بنانے والوں میں پیش پیش کی مگر وہ خود ٹوٹ چکے تھے۔ اکثر اوقات کفِ افسوس ملا کرتے ''نیا ملک تو نہ بنا سکے۔ چلو اسے برٹش انڈیا کی ایک Successor State ہی بنا پاتے۔ ہم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا۔ یہ تو ایک راجواڑہ بن گیا ہے' وہ کالم اور کتابیں لکھنے میں منہمک ہو جاتے۔ کتابیں بھی مفت ہی بانٹ دیا کرتے۔ متاعِ حیات کے بیالیس برس بلوچستان میں تعلیم پھیلانے کے جنون میں صرف کر ڈالے اور یہاں جہالت پروان چڑھتی جا رہی تھی۔ بھنگ کے خودرو پودوں کی مانند خود ہی اُگ رہی تھی بڑھ رہی تھی۔ پروان چڑھ رہی تھی۔ جس بازار میں کتابوں کی دس دکانیں تھیں وہ دیکھتے ہی دیکھتے سناروں اور مٹھائی فروش کی دکانوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ کتابوں کی بجائے لوگ زیور اور مٹھائیاں خریدتے پھر رہے تھے۔

اماں کو فضل جانے کیا پٹی پڑھا جاتا۔ تنگ کر بولیں ''جج پینسٹھ برس کی عمر میں ریٹائر ہوتا ہے اور ڈاکیا ساٹھ برس کی عمر میں۔ حالانکہ ڈاکیے کا کام کہیں زیادہ مشکل ہے۔'' میں نے غور کیا تو مجھے بات میں خاصا وزن محسوس ہوا۔ برزل پاس پہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پہ ڈاک بانٹتا ہے جہاں کم آکسیجن کے باعث دم پھولا رہتا ہے۔ تربت میں باون ڈگری درجہ حرارت پہ ڈاک بانٹتا ہے جہاں گرم ہواؤں کے باعث ہوائی جہاز لینڈ نہیں کر سکتا اور جج تو اپنے کمرے میں پنکھے تلے بیٹھا جو مرضی ہے فیصلے کرتا پھرے۔ اسے نہ تو ڈاک لگانی ہے نہ ہی سارٹنگ کرنی ہے نہ محلے محلے ڈاک بانٹتے ہوئے گرمی سردی اور بولائے ہوئے کتوں کا سامنا کرتا ہوتا ہے۔ قوموں کی تاریخ میں کبھی کبھار جنگ ہوتی ہے جبکہ ڈاکیے کے لیے ہر روز محاذ کھلتا ہے۔ وہ War Footing پر ہی رہتا ہے۔

اسی لیے میں نے سمری بنائی کہ بلوچستان کا رقبہ تقریباً ساڑھے تین لاکھ مربع کلومیٹر گویا وطنِ عزیز کا 42 فیصد ہے۔ اگر موجودہ پوسٹ مینوں کو علاقے پر تقسیم کریں تو ڈھائی ہزار مربع کلومیٹر کے لیے ایک پوسٹ مین بنتا ہے۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے ریٹائرڈ پوسٹ مین کنٹریکٹ پر رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ اعداد و شمار ہولناک تھے جس سے ڈائریکٹر جنرل لرز گیا۔ اُس نے مجھے فون کیا کہ آیا یہ سب کچھ درست ہے۔ میں نے پرزور تائید کی۔ خدا خدا کر کے کنٹریکٹ پر رکھنے کی اجازت حاصل کی۔ فضل کا کنٹریکٹ لیٹر رات گئے جاری کروایا اور اماں کے حضور پیش کیا جس سے وہ کھل اُٹھیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ خدانخواستہ فضل کل کلاں کہیں چل بسا تو بھس بھروا کر اس کی ممی بنوا کر اسی Beat پر اسے رکھنا ہوگا۔

چند ہی ماہ میں فضل کے اندر اچانک ایک تبدیلی آئی۔ وہ اپنے آبائی علاقے میں لوٹنے کے لیے بے کل ہونے لگا۔ ایک روز وہ اپنا دُکھڑا رونے لگا کہ اس کے بھائی، چچازاد اور دیگر اعزا اسے خط لکھے جا رہے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے پاس ہی چلا آئے۔ جانے کیوں وہ بھی اچانک فضل کے لیے مضطرب ہونے لگے تھے۔ میں نے فضل کو سمجھایا کہ اس نے اپنی جوانی اپنی ساری زندگی یہیں گزاری ہے۔ اب تک یہ قدرے کم ترقی یافتہ علاقہ ہے جہاں وہ جانے کا سوچ رہا ہے وہاں کمرشل ازم بہت ہی زیادہ ہے۔ ہر رشتے کو روپے پیسے کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنا بیٹا ملازم کروا دے تو اس کا کوارٹر بھی بیٹے کے ہی نام الاٹ کروا دوں گا۔ فضل کوئی سا بھی کاروبار کر سکتا تھا۔ اس کی بڑی ساکھ تھی۔ مگر اسے چاہتوں اور محبتوں نے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بھائیوں کی محبت میں باولا سا ہوا جاتا تھا۔

میری ترقی ہوئی تو مجھے بھی بابا کی طرح ہی چاہتوں کے رشتے چھوڑ کر فوری طور پر اسلام آباد پہنچنا پڑا۔ ایک ڈیڑھ ماہ بعد اماں کی بیماری کی اطلاع پہ میں گھر چلا آیا۔ مگر اماں اس دُنیا سے رُخصت ہوگئی۔ وہ مجھے بتلایا کرتی کہ پہلے وسائل نہ تھے، ہفتہ بھر برف پڑتی مارچ میں کہیں جا کر برف پگھلتی تین ماہ چھتوں پہ برف جمی رہتی۔ برآمدے سے Icicles لٹکتے رہتے جس کے باعث سردی ناقابل برداشت ہو جایا کرتی اورتم منے سے تھے۔ تمہارا بستر گیلا ہوتا تو میں تمہیں اپنی جگہ پہ سلاتی خود گیلی جگہ پہ سو رہتی۔ تمہیں نرم بچھونوں پہ سلاتی۔ جبکہ میں اسے پتھریلی زمین پہ سلا کر ملول ہو رہا تھا۔

غم گساروں کے ہجوم میں مجھے فضل دکھائی نہ دیا۔ استفسار پہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے آبائی شہر میں منتقل ہو چکا ہے۔ والدہ کی خبر اس تک نہ پہنچ پائی اور نہ ہی کوئی پتہ ملا کہ ہم اسے آگاہ کر پاتے۔ ایک لحاظ سے تو بہتر ہی ہوا فضل کو بہت سخت صدمہ پہنچتا کہ اس کی بہی خواہ Supporter اور ہمدرد اب دنیا میں نہیں رہی۔

حسب معمول اماں قصہ پارینہ ہوئی۔ اس بے رحم دنیا کے لوگ جلد ہی میری اماں کو بھول گئے۔ زندگی کی گھما گھمی بالکل ویسی ہی تھی۔ میں بھی گریڈوں کی دوڑ میں ہانپتا کانپتا اسلام آباد جا پہنچا۔ اب کی بار میں چکوال کے دورے پر نکلا تو ڈاک خانے میں فضل کو بھی منتظر پایا۔ وہ بہت لاغر اور بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر کوہ برو ہی وسطی جیسی دراڑیں اور ویرانیاں تھیں۔ میں نے اسے گلے سے لگایا۔ ہم دونوں دفتر میں آ بیٹھے۔ اس کے بار بار پوچھنے پر کہ اماں جی کیسی ہیں مجھے بتاتے ہی بن پڑی۔ یہ سنتے ہی فضل بچوں کی مانند رونے لگا۔ بارے اسے پانی پلایا، دلاسہ دیا مجھے فضل نے بتلایا کہ بھائیوں کے اصرار پہ وہ سب کچھ تج کے چلا آیا۔ اس کی خوب دعوتیں ہوئیں سبھی نے سینے سے لگایا۔ مگر چند ہی روز بعد ہر کوئی مطالبہ کرنے لگا کہ پینشن کی رقم اسے تھما دے۔ کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا، کوئی سوزوکی خریدنے کا سوچ رہا تھا کہ اسکول کے بچوں کو لانے لے جانے کا کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ غرضیکہ ہر کوئی فضل کو کاروبار میں منافع دینے کا وعدہ کرتا۔ مگر فضل نے Gratuity کی رقم دینے سے معذرت چاہی۔ پہلے پہل سبھی نے سبز باغ دکھائے۔ انکار پہ آنکھیں دکھائیں اور پھر دھتکار دیا۔ اب فضل کا پرسان حال کوئی نہ تھا۔ وہ کرایہ کے مکان میں رہتا تھا اور وہ اپنے ہی شہر میں اجنبی تھا۔ بالکل ہی اکیلا تھا۔ رشتے ناتے ٹوٹ چکے تھے۔ شہر میں اسے کوئی بھی نہ پہچانتا۔ مجھے بہت سے لوگوں سے ملنا تھا۔ سرکاری کام بھی کرنا تھا۔ میں نے فضل کو تسلی دی کہ وہ عزیز و اقارب کو بھول جائے۔ ایسے مورکھ کس کام کے کم بخت برادر یوسف۔

''چھوڑو فضل بھائی! تم اچھے لوگوں میں رہا کرو۔ مجھے کچھ کام بھی کرنے ہیں پھر ملاقات ہوگی۔ فی الوقت تو اجازت چاہتا ہوں۔''

فضل پہ یہ فقرہ گراں گزرا۔ اس کا چہرہ سائیں سائیں کرنے لگا!

''مجھے دوبارہ وہیں لگا دیں اپنی Beat میں واپس جانا چاہتا ہوں۔'' فضل کی موہوم اُمید توڑے بغیر چارہ نہ تھا۔

''دیکھو فضل بھائی! تمہارا کوارٹر کسی اور کو الاٹ ہو گیا تھا اور سرکار نے کنٹریکٹ پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ ڈیلی ویجز کے لیے بھی لازم ہے کہ تیس برس سے زائد عمر نہ ہو۔''

فضل پہ قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ سکوت کے لمحوں کے بعد اس نے سر اُٹھایا ''یہاں تو میرا کوئی بھی نہیں سبھی بے رحم ہیں۔ گدھ جیسے لوگ! میں کہاں جاؤں؟''

میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جس کا مطلب واضح تھا کہ میرے پاس اس کے لیے مزید وقت نہیں ہے۔

''فضل بھائی! چھوڑو ان کو۔ جاؤ اچھے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔''

مصافحہ کر کے آنسو بہاتا فضل باہر نکل گیا۔ میں نے ضروری ریکارڈ منگوایا اور ریونیو پوزیشن دیکھنے لگا۔ اتنے میں ملتجی سا فضل دوبارہ چلا آیا۔ میرے رویے کے سبب اسٹاف نے اسے دروازے پہ روکا نہیں۔

فضل کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ آنکھیں کچھ اندر کو دھنس گئی تھیں۔ بلیک اسٹار سی لگ رہی تھیں۔ فضل نے التجا کی ''میں آپ سے پتہ پوچھنے آیا ہوں۔''

مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ ایک تجربہ کار ڈاکیا مجھ سے پتہ پوچھ رہا تھا۔

''فضل بھائی! تمہیں تو سارنگ بھی آتی ہے۔ ڈاک بھی خود ہی لگاتے ہو دنیا بھر کے پتے ازبر ہیں۔ کمال ہے! اچھا پوچھو کس کا پتہ چاہیے؟''

فضل قدرے متذبذب سا ہوا اور ہچکچاتے ہوئے بولا ''آپ نے کہا ہے کہ تم اچھے لوگوں کے ساتھ رہو۔ یہ بتائیں اچھے لوگ کس ڈلیوری زون میں رہتے ہیں۔ کس Beat میں رہتے ہیں۔ وہ رہتے کہاں ہیں؟''

ممنوعہ چہرے

محمد طارق علی

شروع میں وہ مجھے بالکل بھلا نہ لگا، ایک عام سا، غیر متاثر کن شخص، رنگ گورا، قد چھوٹا، کلین شیو، سیاہ رنگ میں رنگے گھنے بال، قدرے چھوٹی مگر تیز آنکھیں، سادہ لباس۔ یوں اس کی شخصیت میں بظاہر کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ وہ کم پڑھا لکھا تھا لیکن بلا کا چرب زبان، ایسے بندے کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ مجھے اس سے کبھی بھی ملنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن ایک دن اس سے ملنا پڑا اور ہوا یوں کہ کچھ عرصہ پہلے....

میں نے کوئٹہ سے راولپنڈی آتے ہی شہر سے کچھ دور ایک نئی بستی چمن کالونی میں مکان کرائے پر لے کر رہائش اختیار کر لی تھی۔ میرے ساتھ فیملی تھی اس لئے جو مکان بہ عجلت حاصل کیا گیا، اس میں رہائشی سہولتیں تسلی بخش نہ تھیں۔ سو جلد ہی اسے چھوڑنے کا پروگرام بن گیا اور میں نے جس قریب ترین پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ کیا تو یہ وہی شخص تھا جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔

نام اس کا اختر زمان، اٹک پار کا رہنے والا، پشتو سپیکنگ، لیکن چونکہ بچپن ہی سے راولپنڈی میں رہ رہا تھا اس لئے وہ اردو اور پنجابی بھی بہ خوبی جانتا اور بولتا تھا۔ میں ضرورت مند تھا، سو تھوڑے ہی عرصے میں اس سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں، اس نے مجھے چند مکان دکھائے اور اپنی چرب زبانی کے جوہر بھی خوب آزمائے لیکن میں کسی قسم کے کمپرومائز کے لئے تیار نہ تھا۔ تاہم وہ ہر وزٹ پر مجھے یوں ملتا تھا کہ جیسے وہ میرا گہرا دوست ہے، کیوں؟ مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

ایک فیصلے کے تحت مجھے رہنا چمن کالونی میں ہی تھا۔ اس لئے کہ یہاں مکانوں کے کرائے مرکزی شہر کی نسبت سستے تھے۔ اور میں تھا قلم کا مزدور، کم آمدن والا، فری لانسر۔ کئی سال کوئٹہ کی اخباری دنیا میں رہ کر میں وہاں سے جو کچھ بچا کر لایا تھا، وہ سارا پیسہ بچوں کے سکول اور کالج میں داخلوں کے علاوہ ایک سستی سی ڈائیو گاڑی اور تھوڑے سے ضروری فرنیچر کی خریداری میں صرف ہو گیا، جیب تقریباً خالی ہو گئی اور جب جیب میں کچھ نہ ہو یا تیزی سے خالی ہو رہی ہو تو بندہ گھبرایا گھبرایا سا رہنے لگتا ہے۔ سو میری حالت اسی درجے پر آ گئی تھی۔ لیکن انہی دنوں مجھے چند ایک اچھے مقامی جرائد اور اخبارات سے کچھ تحریری کام حاصل ہونے لگے اور یوں کچھ گزارے کی صورت نکل آئی۔

اختر زمان مکانوں کے علاوہ گاڑیوں کا بھی ڈیلر تھا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا:

''طوری صاحب، یہاں ہمارا ایک قریبی دوست ہے جو بڑی گاڑی خریدنا چاہتا ہے، اگر آپ اپنی ڈائیو کار بیچنا چاہیں تو اس سے بات کروں؟''

میں رضامند ہو گیا۔ گو اس سودے میں مجھے فائدہ نہ ہوا لیکن جلد ہی اختر زمان نے مجھے کم قیمت پر ایک اچھی سوزوکی ایف ایکس کار دلوا دی۔ کچھ دنوں بعد کالونی کے مین بازار کے قریب ایک مکان مناسب کرائے پر مجھے مل گیا۔ میں فیملی سمیت وہاں اٹھ گیا۔

ایک روز ماہنامہ ''سوشل لائف'' کے ایڈیٹر نے مجھے ٹیلی فون پر ایک خاص ٹاپک پر خوبصورت سا فیچر لکھنے کے لئے کہا، پیسے معقول بتائے اور کام کی تکمیل کی مدت تھی ایک ماہ۔ میں نے حامی بھر لی، کچھ ایڈوانس بھی مل گیا۔ میں نے غور کیا تو ٹاپک مجھے دلچسپ لگا لیکن مشکل بھی، اس لئے کہ میں نے اس سے قبل کبھی ایسے موضوع پر لکھا نہ تھا۔ پہلے سوچا کہ انکار کر دوں اور ایڈوانس کی رقم متعلقہ ایڈیٹر کو واپس کر دوں لیکن مزید سوچا تو یہ بات مجھ ایسے پرانے لکھاری کی ''شان'' کے خلاف نظر آئی۔ سو میں نے انکار کے بجائے قلم آزمائی یعنی فیچر لکھنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

لیکن اس فیصلے نے مجھے خاصی مشکل میں ڈال دیا۔ ٹاپک تھا ہی ایسا۔ اس کے لئے چند چیدہ ہستیوں کے انٹرویو یعنی روبرو بیٹھ کر ان سے بات چیت کرنی ضروری تھی۔ یہ کام لمبا چوڑا نہ تھا، تاہم کسی قریبی اور اعتماد والے بندے کی مدد کے بغیر اسے مکمل کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن ایسا بندہ کون ہوگا جو میری مدد کرے اور چرچا بھی نہ کرے، میں سوچتا رہا، کئی دن گزر گئے، کسی اچھے سے کنٹیکٹ کی شکل ذہن میں نہ ابھری۔ ہر نئے دن کے ساتھ پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ انٹرویو والا پراجیکٹ میرے دماغ پر پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ میں آغاز لینے کے لئے بے چین تھا مگر کوئی کام کا بندہ بھی تو ملے اور وقت تھا کہ آگے ہی آگے سرکتا جا رہا تھا۔

ایک دن مطلع ابر آلود تھا، مجھے کہیں جانا نہیں تھا

لیکن گاڑی میں تھوڑی مرمت کا کام تھا سو میں چمن کالونی کے چھوٹے سے بازار میں ایک ڈینٹر کے پاس چلا گیا۔ اس کے قریب ہی اختر پراپرٹی ڈیلر کا آفس تھا۔ وہ ایک دکان سے سگریٹ خرید رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

''بخیر، بخیر، جرنلسٹ صاب۔ آپ تو ہم کو بھول ہی گئے، آج ہم کو بھی چند منٹ دو، آؤ، ابھی آپ دیکھو گے کہ ہمارے آفس میں موسم کے حساب سے ایک محفل لگی ہے، ہمارے خاص دوست یار آئے ہوئے ہیں، آپ بھی آؤ، اور ابھی آؤ۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''میں ذرا ڈینٹر سے گاڑی مرمت کرالوں۔''

''یہ رفیق ڈینٹر؟ اپنا ہی بچہ ہے، او رفیقا، ہم گاڑی ایک دم فٹ مانگتا ہے۔''

وہ میرا ہاتھ تھامے اپنے آفس کی طرف چلا، جو سڑک کے کنارے بنے ''راجہ شاپنگ آرکیڈ'' میں تھا۔ اس میں نیم دائرے کی شکل میں دس بارہ دکانیں تھیں، اوران میں سے اکثر خالی۔ اختر کا آفس سب سے آخیر میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے آفس میں تین چار آدمیوں کی محفل جمی تھی، ان میں وہ شخص بھی تھا جس نے میری ڈائیوو گاڑی خریدی تھی۔ اختر زمان نے حاضرین سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''یہ طوری صاحب ہیں، بڑے اچھے آدمی اور اپنے دوست ہیں۔''

آفس ٹیبل پر سافٹ اور ہارڈ دونوں ڈرنکس موجود تھے، یوں یہ کوئی عام سی محفل نہ تھی۔ میں ایک خاص تجسس کے تحت اس محفل میں بیٹھ گیا۔ میری چوائس کے مطابق ایک کولڈ ڈرنک والا گلاس مجھے دے دیا گیا۔ مہمان دوسرے جام پیتے رہے۔ پھر انہوں نے ایک فرمائش کی، اختر زمان نے تعمیل کی اور میز کو طبلے کی طرح بجاتے ہوئے اپنے وقت کا ایک مشہور گیت چھیڑا ؎

سن وے بلوری اکھ والیا اساں

دل تیرے نال لالیا

اس نے گیت اچھی لے کے ساتھ گایا اور سب کی داد پائی۔ اختر زمان کی یہ خوبی مجھے اس روز پہلی بار معلوم ہوئی اور میں اس کی فنکاری پر حیران تھا۔

''اچھا گاتے ہو، پہلے کسی کے شاگرد تھے کیا؟'' میں نے پوچھا

''نہیں طوری جی، بس شوقیہ کبھی کبھار گا لیتا ہوں، ویسے لڑکپن اور جوانی دیوانی کے دنوں میں پنڈی کے سینما گھروں میں اکثر گھسا رہا کرتا تھا اور فلمیں دیکھ دیکھ کر گانے سیکھ لئے۔ اب یار دوستوں کی فرمائش پر ان کا دل پشوری کر دیتا ہوں، لیکن ہر گانے کے ساتھ میرا دل بھی جھومتا ہے۔''

''یار تمہارے گانے کا مزا تو آیا لیکن اگر تم اسی بلوری آنکھ والی کو بلا کر گانا سنوا دو تو پھر زیادہ مزہ آئے گا۔'' ایک صاحب نے جام خالی کر کے اختر زمان سے کہا

''اچھا، سلمٰی بیگم کو؟ ابھی لو۔'' اختر زمان نے موبائل پر نمبر ڈائل کیا اور جواب ملا:

''ابھی میں گھر سے باہر کہیں کام سے جا رہی ہوں، فارغ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔''

تھوڑی دیر بعد یہ دل پشوری والی محفل برخاست ہوگئی، میں بیٹھا رہا، آج مجھے اس راستے کا سراغ مل گیا تھا جو میرے مقصد کی طرف مجھے پہنچا سکتا تھا۔ تخلیہ ہوتے ہی میں نے اختر زمان کو مختصراً اپنے پراجیکٹ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ میں کیسے چہروں سے ملنا اور ان سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا:

''چونکہ وہ چہرے تمہارے واقف ہوں گے، ان سے ملاقات کے دوران تم خود بھی موجود رہو گے اور بات چیت میں میری مدد کرو گے، تم میرا مطلب سمجھ گئے نا؟''

''واہ طوری صاب، میں سمجھا کہ آپ اچھے چہروں سے مل کر دل پشوری کرنا چاہتے ہو مگر آپ تو کوئی مضمون لکھنے کا بول رہے ہو۔''

''ہاں اختر زمان، مجھے ایک رسالے کے لئے مضمون لکھنا ہے اور اس میں یہ بتانا ہے کہ یہ تھوڑے تھوڑے پیسوں میں اپنا وقت اور اپنا آپ بیچنے والی عورتیں اصل میں کیا سوچتی ہیں، اپنی زندگی کے بارے میں، اپنے پاس آنے والے گاہکوں کے علاوہ معاشرے میں اپنی پہچان اور مقام کے بارے میں، اپنے مستقبل کے بارے میں، لیکن ان سے میری ملاقاتیں کیسے ہوں گی اور کب، یہ سوچ کر میں بڑا پریشان تھا اور ابھی تک ہوں۔''

''یارا طوری صاب، آپ ہمارا دل پسند بھائی ہے، آپ کو میں اپنی ''دوستانہ پارٹی'' کا بندہ سمجھتا ہوں، اس لئے کہ آپ بڑے اخباروں میں کام کرتے ہو، پڑھے لکھے ہو اور پھر بھی ہم جیسے چھوٹے اور جاہل لوگوں سے بڑے پیار سے اور بالکل برابری کے طریقے سے ملتے ہو۔۔ آپ جس طرح بھی ہم کو حکم کرو گے، ہم اسی طرح کرے گا۔ ابھی آپ نے ہم کو بولا کہ آپ کافی دن سے اپنے کام کے لئے پریشان ہو

،تو جب آپ کا یہ خادم ادھر بیٹھا ہے تو پھر کیسا پریشانی؟
''

''اختر زمان، تمہاری بہت مہربانی۔''

''نہیں، ہم خالی پیلی نہیں بولتا ہے، ہم کو یہ بتاؤ کہ کیسی زنانی یا لڑکی آپ کو چاہئے، جس عمر اور شکل کا اور جس زبان کا آپ بولو گے، ابھی ایک دو فون کالز پر ہم آپ کے سامنے حاضر کردے گا یا پھر آپ چاہو تو اس کے ٹھکانے پر چلے گا۔۔۔ طوری صاب، ہم پراپرٹی ڈیلر ہے، ادھر ہماری دکان پر جو بھی زنانہ آتا ہے، ہم اس کو ایک نظر سے دیکھ کر جان لیتا ہے کہ یہ شریف ہے یا چالو، شریف کو ہم نہیں چھیڑتا لیکن چالو ہم سے بچ کر نہیں جاتا، ہم اس کو مکان اپنی مرضی کا دیتا ہے لیکن اپنا کمیشن معاف کردیتا ہے اس لئے کہ ہم کو اس سے اپنے کام لینے ہوتے ہیں اور وہ بڑی خوشی سے ہماری بات مانتا ہے، اور آپ کا کام تو یوں سمجھیں کہ ہمارا کام ہے۔''

میں حیرانی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ''تم کب سے ڈیلری کر رہے ہو؟''

''تقریباً تین سال پہلے یعنی کالونی سٹارٹ ہونے کے ساتھ ہی ہم ادھر آ گیا تھا، آج ہمارا پراپرٹی ڈیلری کا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ پہلے جسم میں جوانی تھی تو ہم ڈیلر نہیں تھا، ٹیکسی ڈرایور تھا تو ہم اس وقت بھی عورت کی خوب پہچان رکھتا تھا۔ اور صاب آپ ہماری یہ بات یاد رکھے گا کہ ایک پراپرٹی ڈیلر اور ایک ٹیکسی ڈرایور، یہ دونوں، عورت مرد کا بہت پہچان رکھتا ہے۔۔۔ ہم کو یاد پڑتا ہے کہ ایک بار، یورپ والا ایک گوری لڑکی ائرپورٹ سے ہماری ٹیکسی میں بیٹھا، اس سے ہم نے اپنی انگلش میں پوچھا: ''یو گو ویئر؟'' اس نے بولا: ''چرس شاپ''۔ تو ہم اسے ایک جگہ لے گیا۔ جہاں اسے لگا کہ وہ جنت میں آ گیا ہے۔ اور پھر کبھی اپنے ملک کو واپس نہیں گیا۔ ہاہاہا۔ لیکن ہم نے یہاں کی لوکل اور ضرورت شریف زنانیوں کی مدد بھی بہت کیا ہے کیوں کہ ایسا کرنا ہمارا فرض تھا۔''

اختر زمان نے سیدھے، صاف لہجے میں اپنی شخصیت کے کئی پرت کھول کر میرے سامنے رکھ دیئے، وہ خاصا حیران کن اور دلچسپ سا کریکٹر تھا۔ اسی اثناء میں رفیق ڈینٹر نے میری گاڑی فارغ کر دی۔

''چلئے طوری صاحب، آپ کی گاڑی میں چلتے ہیں۔'' اختر زمان نے گاڑی کا اسٹیرنگ سنبھال لیا اور کہا ''ایک بار بہت شروع میں آپ نے بولا تھا کہ آپ ہاتھ دیکھنا جانتے ہو اور ہمارا ہاتھ دیکھا بھی، پھر آپ نے بالکل ٹھیک ٹھیک ہمارے بارے میں کئی باتیں بتائی تھیں۔''

''ہاں یہ میرا شوق ہے اور میں نے اس فن پر بہت کتابیں پڑھی ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا

''تو ابھی ہم جس زنانی کے پاس جا رہے ہیں، اسے ہم آپ کو اپنا دوست اور ہاتھ دیکھنے والا یعنی کہ پامسٹ بتائے گا، یہ نہیں کہ آپ اخباری آدمی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ سن کر وہ غصہ کرے، لیکن صاب زنانی زبردست ہے، کیا بدن ہے اس کا۔'' اس نے گاڑی چلاتے چلاتے نسوار کی چٹکی منہ میں رکھ لی۔

''ہاں ٹھیک ہے، تم مجھے پامسٹ ہی بولو۔''

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم گل پری کے سامنے بیٹھے تھے۔ قدرے فربہ جسم، بہت ینگ نہ تھی، گورا رنگ، سنہرے بال، کنجی آنکھیں، کلائیوں میں سونے کے کڑے اور انگلیوں میں سلگی ہوئی سگریٹ، غصے میں لگ رہی تھی۔

''کیا بات ہے سوہنیو، آج تمہارا موڈ خراب لگتا ہے۔'' اختر زمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ہاں، ابھی ابھی یہاں سے ایک حرامی اٹھ کر گیا ہے، جھوٹے پیار والے ڈائیلاگ بول رہا تھا۔ یہاں جو بھی آتا ہے ایسے ہی بکواس کرتا ہے۔۔ مجھے تم سے پیار ہے، میں تم پر مرتا ہوں، تیری پیاری صورت دیکھ کر جیتا ہوں۔۔ آخ تھو، گندے لفظ، گندی زبانیں، گندے لوگ، اور اختر زمان، تو بھی یہاں ایسے ہی ڈائیلاگ چھوڑے گا، مفت میں میری بوٹیاں نوچے گا اور چلا جائے گا۔۔ اور ہاں، آج یہ کون مشٹنڈا تمہارے ساتھ آیا ہے اور یہ کیا کرے گا؟''

''یہ میرا دوست ہے، میں اسی کی گاڑی میں آیا ہوں بس تجھے سلام کرنے۔'' اختر زمان نے مسکرا کر کہا۔

''تیرا سلام میری جوتی کو اور یہ تیرا دوست مجھے بٹر بٹر دیکھے جا رہا ہے، لگتا ہے یہ بھی کوئی عشق معشوق والے ڈائیلاگ جھاڑے گا اسے بولو کہ میری شکل کا اتنا زیادہ فوٹو نہ لے، کوئی پیار نہ جتائے، میں جھوٹ سننے کے لئے یہاں نہیں بیٹھی، میں نے دھندا کرنا ہے، تم اسے کہو کہ جو کچھ کرنا ہے کرے، تین چار سرخ نوٹ دکھائے اور چلتا بنے۔''

''نہیں، یہ ایسا آدمی نہیں ہے۔''

''تو پھر یہ کیسا آدمی ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کیا تیری طرح ویلا پراپرٹی ڈیلر ہے یا کوئی خفیہ والا ہے؟''

''نہ یہ ویلا ڈیلر ہے نہ خفیہ والا، یہ ہاتھ دیکھتا ہے، پامسٹ ہے، یہ یہاں کسی کام کے لئے نہیں آیا۔''

''اگر اسے کچھ نہیں کرنا تو کیا یہ میری صورت دیکھنے، میرا وقت ضائع کرنے آیا ہے۔۔اور ہاں، کیا بولا تو نے، یہ ہاتھ بھی دیکھتا ہے؟''

''ہاں، یہ ہاتھ بہت اچھا دیکھتا ہے۔ اور جو بتاتا ہے سچ بتاتا ہے۔''

''کیوں اڑیا، تُو میرا ہاتھ دیکھے گا؟ اور بتا فیس کیا لے گا؟'' گل پری مجھ سے مخاطب تھی۔

''ہاں دیکھ لوں گا، کوئی فیس نہیں کیونکہ تم میرے دوست کی دوست ہو۔'' میرا جواب

''تو پھر میرا منہ کیوں دیکھے جا رہے ہو؟ یہ لو، ہاتھ دیکھو۔''

''ہاتھ تو میں دیکھ لوں لیکن تمہارے کمرے میں بلب چھوٹی پاور کا لگا ہے۔ ہاں، سورج کی روشنی ہو تو ہاتھ کی لکیریں زیادہ بہتر نظر آتی ہیں۔''

''ہا، ہا، ہا۔۔۔کیا بات کی ہے تو نے، سورج کی روشنی؟ اڑیا، مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ سورج کب نکلتا اور کب چھپتا ہے۔ میں تقریباً ساری رات جاگتی اور سارا دن سوتی ہوں، ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھی ہوں، وہ بھی ایک لفنگے کے آ جانے پر، تم کو معلوم نہیں کہ میں اندھیروں میں اجنبیوں کے ساتھ رہتی ہوں، سورج اور اس کی روشنی سے میرا کیا واسطہ؟'' اس کے لہجے میں گہری افسردگی تھی، اسے بہت کچھ لٹ جانے، بہت کچھ کھو جانے کا غم تھا۔

میں مبہوت ہو کر گل پری کو دیکھ رہا تھا، وہ کھلے ڈلے انداز میں بول رہی تھی، مجھے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی باتوں سے اس کی ذاتی کہانی کے مختلف پہلو اور اس کے مزاج کا مخصوص رنگ جیسے خود بخود کسی سانچے میں ڈھل کر میرے سامنے آ رہا تھا۔ میں اس کی گفتگو کو بڑی مستعدی سے اپنے ذہن کے ٹیپ ریکارڈر پر منتقل کرتا جا رہا تھا۔

گل پری کی رہائش والا واحد کمرہ کافی بڑا سا تھا، ایک کونے میں ملحقہ باتھ اور دوسرے کونے میں دو خوبصورت پردے لٹکا کر کچن کی گنجائش نکال لی گئی تھی۔ اب وہاں سے برتن کھڑکنے کی آوازیں آنے لگی تھیں اور چند منٹ بعد ایک شخص سر پر رومال باندھے، ایک ٹرے میں چار پیالیاں سجائے کچن خود ساخت سے برآمد ہوا۔ پہلی نظر میں لگا کہ وہ گل پری کا خاوند یا اس کا پمپ ہوگا۔ لیکن جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ حسن دین تھا، وہی جس نے کچھ عرصہ قبل میری ڈائیوو گاڑی خریدی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اختر زمان کے آفس میں موجود تھا علیک سلیک کے بعد اس نے ایک پیالی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ڈاکٹر نے چائے نوشی سے منع کر رکھا ہے۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ میں حرام کی کمائی والی چیز کیوں قبول کروں۔

''چلو چائے نہ سہی تم میرا ہاتھ دیکھو۔'' گل پری اپنی جگہ سے اٹھ کر دونشستی صوفے پر مجھ سے جڑ کر بیٹھ گئی اور اپنا خوبصورت ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے بہت غور سے اس کا ہاتھ دیکھنا شروع کیا، کچھ حساب کتاب بھی کیا اور پھر بولا:

''گل پری، تم کسی اچھے خاندان سے ہو۔ کوئی واقعہ ایسا ہوا کہ تم اپنے خاندان سے بچھڑ گئیں۔ اس وقت تمہاری عمر پندرہ، سولہ سال تھی اور اب تم تقریباً تیس سال کی ہو اور یوں پندرہ سولہ سال سے یہی دھندا کر رہی ہو، تمہارا ایک بچہ بھی ہے لیکن تمہاری شادی ابھی تک نہیں ہوئی۔'' وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

''تم غلط کہہ رہے ہو طوری صاب، اس کا خاوند تمہارے سامنے کھڑا ہے۔'' حسن دین بولا۔

''مجھے گل پری کا ہاتھ جو بتا رہا ہے، میں نے وہی بولا ہے اور میں اپنی بات پر قائم ہوں۔''

گل پری نے چار پانچ نستعلیق قسم کی گالیاں دے کر حسن دین کو جھاڑ دیا اور مجھ سے کہا:

''بابو، تم نے بالکل ٹھیک بولا، تمہاری باتیں سن کر میں حیران ہوں، ابھی اور کچھ بتاؤ، یہ بھی کہ میرا اگلا زمانہ کیسا ہے؟''

''تم برے لوگوں میں پھنسی ہو، اس چکر سے نکل سکتی ہو اگر کوشش کرو، تب۔''

''نہیں، میں اب کہاں جاؤں گی، میرا بچہ یہاں ایک سکول کے ہاسٹل میں رہتا ہے، مجھے اس کے لئے جینا ہے، اللہ کرے، وہ بڑا آدمی بنے۔'' اس نے ایک لمبا کش بھرا اور سگریٹ پھینک دی۔ حسن دین، اس کا نام نہاد خاوند، ٹرے میں خالی پیالیاں لے کر کچن میں چلا گیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا، گل پری سے اجازت چاہی، وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھی، مسکرا کر مجھے الوداع کہا اور یہ بھی کہ:

''مجھے تم سے ملنا بہت اچھا لگا، جب چاہو، ادھر آ جایا کرو، اختر زمان کے بغیر بھی، تمہارے لئے کوئی فیس نہیں ہوگی۔'' اس کے چہرے پر جمی کرختگی قدرے کم ہوگئی تھی۔

''شکریہ، میں اس لائن کا آدمی نہیں ہوں۔'' میں اختر زمان کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ گل پری سے ملاقات میری توقع سے کہیں زیادہ فائدہ مند رہی۔

دو تین دن گزر گئے۔

مجھے موبائل پر اختر زمان کی کال آئی: ''طوری صاب، ابھی آپ میرے آفس فوراً آؤ، یہاں ایک خاص مہمان آیا بیٹھا ہے، ہم چائے آپ کے ساتھ پئیں گے۔'' اور چند منٹ بعد میں اس کے آفس میں تھا۔ برقعے میں ملبوس ایک بے حد جان لیوا شکل میرے سامنے تھی۔ اس کا نام زری تھا۔ میں نے انٹرویو شروع کیا۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟'' میرا ایک عجیب سا سوال، حالانکہ پوچھنے کی ضرورت تو نہ تھی۔

''آپ جیسے لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' اس نے منہ بنا کر طنزیہ انداز میں کہا۔

''بھلئے لوکے، اگر منہ اچھا ہے تو تم بات بھی اچھی طرح کرو۔ دراصل تم جانتی نہیں ہو، یہ میرا بہت پیارا دوست ہے، یہ ہر ایک زنانی سے نہیں ملتا، یہ ملکوں ملکوں پھرا ہے، اچھی شکل اس کا مسئلہ نہیں۔'' اختر زمان نے کہا۔

''تم لوگوں کو خوش کرنے کے علاوہ اور کیا کرتی ہو؟'' میرا سوال

''اصل کام تو یہی ہے لیکن ایک اور بزنس بھی ہے، بوتیک چلاتی ہوں۔''

''اتنا اچھا بزنس کرتی ہو تو یہ گندہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟''

''کوئی چھوڑنے دے تب نا۔''

''شادی کی ہے؟''

''ہاں، وہی میرا گاڈ فادر بھی ہے۔''

''پڑھی لکھی لگتی ہو، کہاں تک پڑھا؟''

''یہ مت پوچھئے، آپ صرف کام کی بات کیجئے، مجھے کہاں جانا ہوگا؟''

''کہیں بھی نہیں، یہیں گپ شپ ہوگی۔''

''گپ شپ نہیں چلے گی، یہ میرے دھندے کا وقت ہے یا پھر فیس دے کر گپ شپ کیجئے۔''

میں نے پانچ سو ہارس پاور والا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اتنے میں بیرا چائے لے آیا۔

''کبھی تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا؟'' میں نے چائے کی چسکیوں کے دوران پوچھا

''میں تو مشین ہوں، مشین کا مستقبل کیسا؟ پرانی ہونے پر اسے پھینک دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری مشین لے لیتی ہے۔'' شروع سے اب تک وہ اکتائے ہوئے اور طنزیہ لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے برقعہ بھی اوڑھ رکھا تھا مجھے اس کی جسمانی زبان کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

''تمہارے ماں باپ کیا کرتے تھے اور کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''میں سب کچھ بھول چکی ہوں، میرے ذہن میں اندھیرے یا پھر مکروہ چہروں کے عکس بھرے ہوئے ہیں، اور....اور آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا مجھ سے ہمدردی جتانی ہے یا مجھے کسی اچھے مستقبل کی خوشخبری دینی ہے؟''

''بھلئے لوکے، پھر وہی بات، اتنا غصہ کیوں؟ اب تو تم کو فیس بھی مل گئی ہے۔'' اختر زمان نے پھر مداخلت کی۔

''تم اپنی فیس واپس لے لو، مجھے کوئی انٹرویو نہیں دینا، میں روز جیتی ہوں، روز مرتی ہوں، میرا انٹرویو کیسا؟''

اور اسی کے ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی شروع ہوگئی۔ جانے یہ آنسو کب سے رکے ہوئے تھے۔ بہرحال آنسوؤں کے ساتھ انٹرویو ختم ہوگیا۔ میں اسے چپ چاپ اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ پانچ سو کا نوٹ کرسی پر چھوڑ گئی تھی۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ کچھ نہ بول کر بھی بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میگزین ایڈیٹر کے تقاضے والا فون آ چکا تھا، کیونکہ پرچہ پریس جانے کے لئے تیار تھا۔ میں نے ایڈیٹر کو بتایا کہ منصوبہ فیچر فائنل ٹچز کے بعد اسے جلد ای میل کر دوں گا۔

'ایک انٹرویو اور مل جائے تو میرا فیچر مکمل ہو جائے گا' میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ مجھے اختر زمان کا بھی خیال آیا، وہ تو بڑے کام کا آدمی نکلا۔ چند دن پہلے تک تو میرے نزدیک اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی مگر اس نے ثابت کر دیا کہ میری سوچ غلط تھی، اسی کی کاوشوں کی بدولت پہلے دونوں انٹرویوز بہت اچھے رہے اور اب تیسرے اور فائنل انٹرویو کے لئے مجھے اس کی کال کا انتظار تھا، آخر ایک صبح گیارہ بجے اس کا فون آ گیا۔

''طوری صاب، راول جھیل کے قریب ڈائمنڈ موٹل چلنا ہے، فوراً آ جاؤ اور ہاں، آپ کو اپنے بہترین سوٹ میں آنا ہے، میں نے ایک کرائے کی ہنڈا سٹی بھی منگالی ہے۔'' میں نے بہ عجلت تعمیل کی

آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ موٹل کے ریزرو کیبن میں ایک خاص چہرہ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

''یہ مس شائلہ ہیں اور یہ ہماری فرم کے ڈائریکٹر ایم وہاب صاب!'' اختر نے تعارف

کرایا۔" دیکھنے میں سادہ لیکن بڑے کاروباری آدمی ہیں، اپنے امپورٹ ایکسپورٹ کے کام میں آدھی دنیا گھوم چکے ہیں۔ انہیں آج کل آپ جیسی خوبصورت، سمارٹ اور تعلیم یافتہ پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے۔ اور اس کی ڈیوٹی ہوگی آفس کے ضروری کام انجام دینا، آنے والی کالوں کا ریکارڈ رکھنا اور ان تمام کاموں کے ساتھ صاب کے موڈ مزاج کا بھی خاص خیال رکھنا لیکن پہلے کام کا ٹرائل اور پھر تنخواہ کی بات ہوگی۔"

"اوکے۔" وہ خوشبوؤں میں بسی، جدید انداز سے آراستہ پیراستہ، خوش رنگ و خوش ادا، حور شمائل مسکرائی۔

اتنے میں بیرا کافی اور لوازمات لے آیا۔ کافی کے ساتھ ہماری دھلی دھلائی انگلش میں گفتگو ہوتی رہی اور اختر زمان بڑی بے نیازی کے ساتھ ایک میگزین دیکھتا رہا۔ میں دل ہی دل میں اس کی دانائی اور اداکاری کی داد دے رہا تھا۔ اختر زمان کے جاندار تعارف کے بعد وہ حور شمائل بالکل سپر انداز ہو چکی تھی، یہاں تک ہوا کہ اس کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کر کے وہ اپنے بہت کھلے گلے کے ساتھ میرے گلے کا ہار بن گئی۔ اس نے میری ٹائی کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہا:

"وہاب صاحب، اپنا کارڈ عنایت کیجئے نا۔"

"ہم تو آپ کی سلیکشن کا سوچ رہے ہیں، یہ بتایئے کہ دفتر کے روٹین ورک کے علاوہ آپ ہمارے ذاتی آرام کا کیسے خیال رکھیں گی؟"

"آپ کے آفس میں ریٹائرنگ روم تو ہوگا تو وہاں ایک مقررہ ٹائم پر "ساقی" کے ہاتھوں آپ کا پسندیدہ ڈرنک آپ کو ملے گا اس کے علاوہ جسمانی تھکن دور کرنے کے لئے مساج یا جو کام آپ چاہیں فوراً کیا جائے گا۔"

"گڈ، ہمیں آپ سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی، لگتا ہے کہ آپ کو خاصا تجربہ حاصل ہے؟" میں نے پوچھا

"جی ہاں، دنیا ہے ہی ایک تجربہ گاہ کا نام!"

اسی کے ساتھ شمائلہ کی دلکش ہنسی کا فوارہ، اس کی مخروطی انگلیاں نیک ٹائی سے ہٹ کر میری قمیض کے بٹن کھول چکی تھیں، میں اس کی مسحور کن نگاہوں اور خوشبوؤں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

"اور ہاں، آپ کی عمر، تعلیم اور فیملی بیک گراؤنڈ؟" میں نے یونہی اس سے ایک سوال کر دیا۔

"وہاب جی، اس وقت ان باتوں کی کیا ضرورت؟ میرا سی وی آپ کو مل جائے گا۔" وہ اٹھلا کر بولی: "اور ہاں، ان دوسرے صاحب کو ذرا باہر جانے کا کہیے، مجھے آپ سے چند ایک ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

اختر زمان فوراً باہر چلا گیا۔ شمائلہ کی "ضروری باتوں" میں کچھ بھی نہ تھا سوائے اسٹرپ ٹیز کے، سلو موشن میں ایک بہت جادو بھرا اور مدہوش کن ایکشن!

"کہیے، آپ کو ٹرائل پسند آیا؟" اس نے دوبارہ ریڈی ہو کر اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے۔

"آپ کو اپائنٹمنٹ لیٹر کل اسی جگہ مل جائے گا۔" میرا مدہوشی کے عالم میں جواب۔

اور اسی وقت وہی بیرا اندر آ گیا، کباب میں ہڈی بن کر، برتن اٹھانے کے لئے۔ جاتے جاتے اس نے ایک موبائل شمائلہ کو دیا۔ "آپ کی کال ہے۔" اس نے موبائل سنا نہیں اور سامنے کہیں تکا دیا۔

انٹرویو مکمل ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے شمائلہ سے رخصت چاہی تو اس نے راستہ روکتے ہوئے کہا: "سنئے، اپوائنٹ منٹ لیٹر ملے یا نہ ملے ابھی آپ میرے اس وزٹ کی دس ہزار روپے فیس دے کر جائیں گے، ورنہ..... معاملہ سیریس بھی ہو سکتا ہے، ڈائرکٹر صاحب!" شمائلہ کے ہاتھ میں موبائل آن تھا، اس کے وڈیو میں اسی جادوئی ایکشن کے مناظر گھوم رہے تھے۔ عزت بچانے کے لئے تاوان تو دینا ہی تھا، سو ایک چیک کے ذریعے اس "فنکارہ" کا مطالبہ پورا کر دیا گیا اور اسی وقت اس کا موبائل ہوش ربا مناظر سے پاک ہو گیا۔

پھر کئی دنوں کی پر تجسس کوششوں کے بعد پتہ چلا کہ شمائلہ سوشل حلقوں میں کافی مشہور ہے اپنے "بلیک میلر کوئین" کے لقب کے ساتھ۔ اور وہ کیبن میں کافی لانے والا نوجوان بیرا اس کا باڈی گارڈ، فوٹوگرافر اور پارٹنر بھی ہے۔ زیادہ غور کیا تو مجھے اچھا خاصا شک اختر زمان پر بھی ہوا کیونکہ وہ دوستی کے لبادے میں بنیادی طور پر ایک چرب زبان کمیشن ایجنٹ ہی تھا اور ایسے پروفیشنل آدمی کا کا ٹا پچتا نہیں۔

اسی اثناء میں میرا فیچر مذکورہ میگزین میں شائع ہو چکا تھا اور ایک ڈھلتی شام کے بے جان ہوتے لمحوں میں ایڈیٹر صاحب نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کرتے ہوئے فیچر کی بہت تعریف کی۔ ان کے بقول سبھی "ممنوعہ" زنانہ چہرے بہت اچھے اور "فٹ" تھے۔ انگوٹھی میں جڑے نگینوں کی طرح۔ ان کے نزدیک اختر زمان کا کردار بھی بڑا جاندار تھا اور میں ایک پر ملال خاموشی میں گھرا کھڑا تھا، میرے خالی ذہن میں کچھ بھی نہ تھا ایک بڑے سے سوالیہ نشان کی طرح۔

صحرا میں پکار

شائستہ مفتی/کراچی

صحرا کی گرم ریت پر چلتے چلتے اچانک ہی اُسے کہیں دور سے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ پلوشہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی، کچھ نظر نہیں آیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟ صحرا میں جب ہوا تیز چلتی ہے تو آواز کی سمت کا تعین کرنا ممکن نہیں رہتا۔ آواز کبھی قریب سے آتی ہے اور کبھی ہوا کے جھکڑ آواز کو اپنے دوش پر کہیں دور لے جاتے ہیں۔

''یا اللہ! میں کہاں ڈھونڈوں اپنے بیٹے کو؟''

پلوشہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب وہ صرف اپنے بیٹے کے ساتھ ہی زندگی بسر کرے گی، چاہے زندگی کا سفر اکیلے ہی کاٹنا پڑے۔ مگر یہ اس وقت گڈو کہاں چلا گیا ہے؟ کہیں وہ اپنے باپ کے پاس نہ چلا جائے۔ نہیں!! ایسا نہیں ہو سکتا!! پلوشہ زور زور سے آواز لگانے لگی۔

''گڈو....! گڈو......!'' صحرا کی تیز ہوا میں پلوشہ کی آواز بھی اپنے زاویے بدلتی، کبھی واپس آرہی تھی اور کبھی انجانے راستوں پر نکل رہی تھی۔ پتا نہیں گڈو تک میری آواز جا بھی رہی ہے کہ نہیں!! اسی کشمکش میں پلوشہ کبھی ایک جانب بھاگتی اور کبھی دوسری جانب۔ آخر کار گڈو مل ہی گیا۔ ایک چٹان کے پیچھے گڈو بڑے انہماک سے کچھ دیکھ رہا تھا۔ پلوشہ گڈو پر برس پڑی ''کیا کر رہے ہو یہاں؟ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔''

گڈو نے نگاہیں اُٹھا کر ماں کو دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت اور معصوم آنکھوں میں حیرت کا ایک سمندر موجزن تھا۔ ماں کو پریشان دیکھ کر گڈو بھاگ کر ماں کے سینے سے جا لگا۔ پلوشہ کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ پیار سے گڈو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' گڈو نے مسکراتے ہوئے ماں کا ہاتھ پکڑا۔

''دیکھئے امی یہ چیونٹیوں کی فوج ہے۔ بالکل سیدھی لائن میں چل رہی ہے۔'' گڈو نے چٹان کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا ''میں بھی بڑے ہو کر فوجی بنوں گا۔ ابو کی طرح۔'' پلوشہ نے گڈو کے گلابی ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں بیٹے! میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

گڈو نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔ پلوشہ کو لگا کہ جیسے گڈو کی حیران آنکھوں کے لیے یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ پلوشہ نے اپنے بیٹے کے لیے دل سے دعا کی۔

اے اللہ! میرے بیٹے کی آنکھوں کی حیرانی کو ہمیشہ قائم رکھنا۔'' یہ حیرانی ہی تو ہے جو نئے جہان تلاش کرنے کے لیے اُکساتی ہے۔ میرا بیٹا نئے جہان تلاش کرے گا، ساری دنیا دیکھے گا، بہت سی خوشیاں اس دنیا کو دان کرے گا۔

پلوشہ کو وہ دن اچھی طرح یاد ہے کہ جب صحرا کی تیز ہواؤں میں اس نے سخت بوٹوں کی دھمک سنی تھی۔ پلوشہ سمجھی کہ شاید کوئی وہم ہے۔ صحرا کی تیز ہواؤں میں اکثر ایسی آوازیں بھی ہوتی ہیں جن کا اہم ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ تیز ہوائیں وہ سرگوشیاں بھی لے آتی ہیں جو کسی اور کا راز ہوتی ہیں۔ دروازے پر جب تواتر سے کھٹکھٹانے کی آوازیں آئیں تو پلوشہ نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں گاؤں کا نمبردار اور اس کے پیچھے کچھ فوجی نظر آئے۔

پلوشہ نے سوالیہ تاثرات کے ساتھ نمبردار سے پوچھا: ''کیا ہوا؟''

نمبردار نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ پیچھے کھڑے فوجی نے پوچھا ''جہاں داد کی زوجہ آپ ہیں؟''

پلوشہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فوجی نے کرب کے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''مبارک ہو جہانداد نے ابدی زندگی پائی ہے۔'' پلوشہ کو محسوس ہوا کہ جیسے صحرا کی منہ زور ہوائیں آوازوں کے ساتھ اس کا وجود بھی اپنے ہمراہ کہیں دور اُڑا کر لے گئی ہیں۔ ہر طرف ریت ہی ریت ہے اور دور اُڑتے بگولے۔ آوازوں کا تعین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ کون کیا کہہ رہا ہے؟ دیکھتے ہی دیکھتے پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ سسرال والے، میکے والے، جہانداد کے دوست احباب۔ سب اپنی اپنی بولی بول رہے تھے۔ سنا ہے جہانداد ڈرون کے حملے میں مارا گیا۔ ڈرون تو صرف دہشت گردوں کے لیے ہوتے ہیں۔ پھر جہانداد کیسے مارا گیا؟ جہانداد تو اس ملک کا سپاہی تھا۔ صحرا میں آواز کا پتا ہی نہیں چلتا کہ کہاں سے آرہی ہے۔

جہانداد کو بھی پتا نہیں چلا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے اور وہ وہاں چلا گیا جہاں اسے نہیں جانا چاہیے تھا۔ بچھڑنے کا دکھ کچھ کم ہوتا ہے جو یہ صحرا کی ہوائیں مزید بھڑکانے آجاتی ہیں۔

''امی مجھے بہت بھوک لگی ہے۔'' آوازوں کے اس دشت میں پلوشہ کو ایک ننھی سی آواز نے چونکا دیا۔ پلوشہ نے اپنے تین سالہ گڈو کی طرف دیکھا جو اپنی آنکھوں میں حیرانی کا ایک سمندر لیے اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ پلوشہ کو جیسے ایک ہی جھٹکے میں ہوش آ گیا۔ چہار سو چلنے والی تیز ہوائیں جیسے تھم سی گئیں۔ پلوشہ نے اپنے گڈو کو گود میں اُٹھا لیا اور اُس کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے میں لگ گئی۔

آوازوں کا طوفان تھما تو حقیقت کی کڑی دھوپ تھی اور تپتا صحرا۔ سسرال والوں کے اصرار پر پلوشہ ساس سسر کے گھر رہنے لگی۔ ارادہ تھا کہ عدت وہیں پوری کرے گی۔ گڈو بھی بہت خوش تھا۔ سارا سارا دن اپنے دادا اور دادی سے لاڈ اُٹھواتا۔ گڈو کے قہقہوں سے گھر گونجتا رہتا۔ گڈو کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر پلوشہ بھی مسکرانے لگی۔ جانے والوں کے ساتھ زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ وقت تو آگے کی سمت ہی بڑھتا ہے۔

جہانداد کی شہادت کے صلے میں حکومت نے گڈو کے نام ایک پلاٹ دیا تھا اور پلوشہ کے نام سے

کچھ پنشن بھی ملنے لگی تھی جو ماں بیٹے کی ضرورت کے لیے مناسب تھی۔ گزارا ٹھیک ہی ہو رہا تھا، شکر اللہ کا کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانے پڑ رہے تھے۔ پلوشہ جوان تھی، خوبصورت تھی۔ مگر اس کے جذبات تو جیسے صرف جہانداد کے لیے ہی تھے۔ یادِالٰہی میں دل لگا کر پلوشہ نے مشیت ایزدی کے سامنے سر جھکا دیا۔ راتوں کے پچھلے پہروں میں اٹھ کر وہ عبادت کرتے کرتے مصلے پر ہی سو جاتی اور خوابوں میں جہانداد سے ڈھیروں باتیں کر لیتی۔ جی کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

پھر ایک دن جب پلوشہ کے دیور نے اُسے پھولوں کے گہنے لگا کر دیے تو وہ حیران سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اپنے دیور کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھ کر پلوشہ تو جیسے ڈر ہی گئی اور پھر ساس نے ایک دن پلوشہ سے کہہ ہی دیا: ”دیکھو پلوشہ میرا تو جوان بیٹا ہی جان سے گیا ہے۔ پلاٹ تمہارے بیٹے کے نام ملا ہے۔ تم ابھی جوان ہو، جہانداد کے بھائی سے نکاح کر لو۔ گھر کی چیز گھر میں ہی رہ جائے گی۔“ پلوشہ کو تو جیسے کسی بجلی کے ننگے تار نے چھو لیا۔

اس رات پلوشہ نے رو رو کر جہانداد سے اس کے گھر والوں کی شکایت کی جو شاید وفا کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ رشتوں کے تقدس سے ناواقف تھے۔ سسرال کا گھر اور اس گھر کے سب در و دیوار پلوشہ کو اجنبی لگنے لگے۔ رات کی تاریکی میں پلوشہ نے اپنا مختصر سا سامان باندھا، پلاٹ کی فائل اُٹھائی، سوتے ہوئے گڈو کو کاندھے پر اُٹھایا اور سنسان گلی میں نکل آئی۔ ماں کا گھر کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

ماں کے گھر میں پلوشہ کا استقبال آہوں اور سسکیوں سے ہوا۔ گھر کے سب افراد اپنی جوان بیٹی کے اُجڑ جانے پر نوحہ کناں تھے۔ باپ کے کاندھے کچھ اور زیادہ جھکے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ پلوشہ کہاں جاتی؟ کس سے مدد مانگتی؟ زندگی کی گاڑی پھر سے ست روی سے چل پڑی۔ گھر میں شادی شدہ بھائی بھی رہتے تھے۔ پلوشہ اپنے بھائیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سارا سارا دن باوجوں کی خدمت کرتی تا کہ اپنے اس گھر میں رہنے کا جواز پیدا کر سکے۔ بھائیوں کا ساجھا کاروبار تھا۔ کبھی اچھا چلتا اور کبھی مندی رہتی۔ پلوشہ کی جوان بیوگی اماں ابا کے سینے پر ایک پتھر کی طرح ہر لمحہ دھری رہتی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ لگتی تھی۔ ہواؤں کا طوفان جس میں سرگوشیاں وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا تھا، اس کی خبر تو کسی کو بھی نہیں تھی۔ مگر گڈو کو ابھی سکول بھیجنا تھا۔ پلوشہ گڈو کو ایک اچھا مستقبل دینا چاہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ گڈو کو شہر کے اسکول بھیجے گی۔ جہانداد کی بھی یہی خواہش تھی۔

اور پھر جنگ کے سایے دن بدن سیاہ ہوتے چلے گئے۔ پلوشہ کے بھائیوں کا کاروبار دن بدن ٹھپ ہوتا چلا گیا۔ گھر میں کھانے پینے کی اشیا کا بھی کال پڑنے لگا۔ پلوشہ سے جتنا ممکن ہوتا وہ میکے والوں کی مدد کر دیتی۔ مگر گڈو کا ساتھ تھا، کچھ اپنے لیے پس انداز کرنا بھی ضروری تھا۔ بڑے بھائی نے پلوشہ کے سامنے ایک انوکھی تجویز رکھ دی۔

”تم گڈو کے نام جو پلاٹ ہے وہ بیچ دو۔ جو رقم حاصل ہو گی ہم اس سے شہر میں کاروبار شروع کریں گے۔ تم ہمارے ساتھ ہی رہنا۔ ابھی تم جوان ہو۔ کوئی اچھا بر ملا تو تمہاری شادی کر دیں گے۔ گڈو ہمیشہ ہماری ذمہ داری رہے گا۔“

پلوشہ خالی خالی نظروں سے اپنے بھائی کو تکنے لگی۔ صحرا کی ہوائیں اتنی شدت سے چلیں کہ پلوشہ کے سر سے چادر اُتر گئی۔ پلوشہ کو محسوس ہوا کہ وہ آوازوں کے جنگل میں کہیں کھو گئی ہے۔ ہر آواز اُسے بھٹکانے کی کوشش کر رہی ہے۔ سرگوشیاں وہ جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ قریب تھا کہ وہ ہوا کے زور پر کہیں دور جا گرتی، ایک چھوٹا سا ہاتھ پلوشہ نے اپنے کاندھے پر محسوس کیا ”امی مجھے نیند آ رہی ہے۔“ پلوشہ نے گڈو کے معصوم چہرے کو غور سے دیکھا تو اُسے محسوس ہوا کہ گڈو کے نین نقش بالکل جہانداد کی طرح ہیں۔ دلاسے کی نرم گرم چادر نے پلوشہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ”جہانداد تم یہیں کہیں ہو......!“

ایک ہاتھ سے گڈو کا ننھا منا سا ہاتھ تھامے دوسرے ہاتھ سے جب پلوشہ نے گھر کا تالا کھولا تو ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ آنگن میں سوکھے پتوں کا ڈھیر، باورچی خانہ گرد سے اٹا پڑا تھا۔ گھر کے ہر کونے میں جہانداد کی یادیں بکھری تھیں۔ مسرت بھری یادیں، اسی گھر میں پلوشہ نے سچ مچ جینا سیکھا تھا۔

پلوشہ نے الماری کھول کر پلاٹ کی فائل احتیاط سے رکھی۔ تالا لگا کر چابی کو سنبھال کر رکھ دیا۔ یہ پلاٹ نہیں گڈو کا مستقبل تھا۔ یہ امانت تھی اُس خواب کی جو جہانداد نے اپنے بیٹے کے لیے دیکھا تھا۔ پلوشہ نے اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے ساز و سامان کو ایک حسرت بھری نظر سے دیکھا اور سوچنے لگی کہ زندگی کا سرا کہاں سے پکڑے......؟ کہاں سے شروع کرے......؟

دو دن گھر کی صفائی ستھرائی میں گزر گئے۔ کچھ بہتری کے آثار نظر آئے تو محلے پڑوس میں ملنے گئی۔ لوگوں کو راضی کیا کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن پڑھنے اس کے پاس بھیج دیا کریں۔ فی سبیل اللہ کام میں جزیہ کے طور پر کچھ دینا چاہیں تو دے دیں ورنہ اللہ تو مددگار ہے ہی۔

زندگی یوں ہی سہی، گڈو چار سال کا ہونے والا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو جائے گا۔ پلوشہ گڈو کے معصوم اور حیران چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتی کہ میں شہید کی بیوہ ہوں، ابدی زندگی میں جہانداد کے سامنے فخر سے جاؤں گی انشاءاللہ......

اب بھی جب کبھی صحرا کی تیز ہواؤں میں ڈرون کی خوفناک آواز آتی ہے تو پلوشہ ڈر سی جاتی ہے۔ کیونکہ تیز ہواؤں کا کچھ پتا نہیں چلتا، آواز کو اپنے دوش پر اُڑا لے جاتی ہیں۔ قریب کی آوازیں دوہر سنائی دیتی ہیں اور دور کی آواز قریب لگتی ہے۔ صحرا کی سرگوشیوں کا کوئی اعتبار نہیں، یہ سرگوشیاں وہاں پہنچتی ہیں جہاں ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ پلوشہ نے آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں اور ہاتھ پھیلا کر دعا مانگی کہ اللہ اس کو آوازوں کے اس جنگل میں بھٹکنے سے بچائے۔ آمین

عاصم ثقلین درانی /بہاولپور

حسرتیں روکے ہوئے، غم کو چھپائے ہوئے لوگ
بار خود اپنی ہی لاشوں کے اُٹھائے ہوئے لوگ
سوختہ خواہشوں، خوابوں کی اُٹھائے ہوئے راکھ
وقت کی دوڑ سے تھک ہار کے آئے ہوئے لوگ
واہمے، خوف، سراسیمگی، شرمندگیاں
ساری محرومیاں چہروں پہ سجائے ہوئے لوگ
جانے اب حشر اُٹھا دیں کہ فنا ہو جائیں
ضبط کی آخری دہلیز تک آئے ہوئے لوگ
پاس سے گزریں تو ہر سانس بھگو دیتے ہیں
رنگ اور نور کی بارش میں نہائے ہوئے لوگ
جیسے جھک جائیں ذرا بھر تو چٹخ جائیں گے
گردنوں پر ہیں کلف زر کا لگائے ہوئے لوگ
بوجھ اتنا ہے کہ آواز نکلتی ہی نہیں
اپنی قامت سے بڑے عہدے اُٹھائے ہوئے لوگ

ضبط کی آخری دیوار کو ڈھایا جائے
دوستو! اب کوئی طوفان اُٹھایا جائے
ختم ہو جبر کی فرسودہ روی کا قصہ
اب ہواؤں کو چراغوں سے جلایا جائے
کسی سردار کا سر، دار کی زینت ٹھہرے
سچ کی اسناد کو مسند پہ بٹھایا جائے
پھر سے ہم ریت کے گرداب میں گھر بیٹھے ہیں
سبز باغ اور وفاؤں کا دکھایا جائے
اب تو ہر درد کی تعلیم دلائی جائے
اب تو بچوں کو ہر اک زخم پڑھایا جائے
اُس کے گھر کو جو پناہ گاہ سمجھ بیٹھے ہیں
اُنھیں قاتل کا پتا صاف بتایا جائے

پھولوں جیسے پیراہن میں چمکیلے بھڑکیلے لوگ
تیرے شہر میں آ کر دیکھے کتنے رنگ رنگیلے لوگ
درد لپٹ کر چہروں سے سب رنگ اُڑا لے جاتا ہے
جھونپڑیوں میں کب ہوتے ہیں سنورے اور سجیلے لوگ
نفرت چوٹ پہ ڈنکے کی، اور ظلم بہ بانگِ دہل کریں
چاہت کے اظہار پہ اکثر بن بیٹھیں شرمیلے لوگ
بلی کے رستہ کاٹے پر بیٹھ گئے ہم سے کاہل
دیواروں کو پھاند کے نکلے چست، جواں، پھرتیلے لوگ
اوّل اوّل ریشم سا من، موم کلیجہ رکھتے تھے
آخر آخر کر بیٹھے ہیں اپنے دل پتھریلے، لوگ
ہوا ہوس کے شور میں میٹھے بول کو ترسے کان یہاں
میرے چاروں اور بسے ہیں کڑوے، ترش، کسیلے لوگ

سرخیوں میں مت اُڑا مفلس کے گھر کی داستاں
بے حسی کی نذر مت کر چشمِ تر کی داستاں
گریۂ مولود سے تاریکیٔ برزخ تلک
زندگانی، دل ہلا دیتے سفر کی داستاں
دل لگی سارے فسانے، ہر کہانی کھیل ہے
میرے سب خوابوں کا محور میرے گھر کی داستاں
روشنی کے استعارے کیا، منارے بے اثر
کتنی کرب انگیز شہرِ بے بصر کی داستاں
استقامت، سچ، وفا، ایثار، خودداری بہم
ایک نیزے کی انی پر ایک سر کی داستاں
دردِ گمنامی سے زخمِ ناپذیرائی تلک
میرے خاک اور خون میں لتھڑے ہنر کی داستاں

کیا ہوا، کس طرح ہوا لوگو
مجھ کو کہنا ہے برملا لوگو
اُس کی آنکھوں میں وہ چراغ جلے
دل کا گھر جگمگا اُٹھا لوگو
اُس کی باتوں میں ایسی خوشبو تھی
خود پہ قابو نہیں رہا لوگو
اُس کے پیکر میں ایسا جادو تھا
ہم نے سب کچھ ہی تج دیا لوگو
جونہی منزل نظر میں لہرائی
تم نے روکا تھا راستہ لوگو
جونہی آنکھوں میں خواب مُسکائے
تم نے پتھر لیے اُٹھا لوگو
سرگرانی بڑھائی اُس نے بھی
تم بھی ٹھہرے چراغ پا، لوگو
آخر اُس نے جھٹک لیا دامن
اور تمھیں چین آ گیا لوگو
پھر وہ ہجراں کے دن قیامت سے
پھر وہ ہر شب کا رت جگا لوگو
دھوپ تھی، تشنگی تھی، صرصر تھی
پھول کملا کے رہ گیا لوگو
لمحہ لمحہ بڑھی ہر اک ظلمت
تارا تارا گھٹی ضیا لوگو
تیل گھٹتا گیا چراغوں کا
تیز ہوتی گئی ہوا لوگو
اک دفعہ دیکھ کے ہمارا گھر
درد بھولا نہ راستہ لوگو

ڈاکٹر جاوید باتش/لاہور

ڈاکٹر جاوید باتش کے شعری مجموعے ''خموشی بھی صدا ہے'' سے انتخاب

فصیلِ شہر بھی ڈوبی ہے گھر کی بات نہ کر
برا نہ مان لے دریا بھنور کی بات نہ کر
یہ روشنی کا تعاقب تو جان لیوا تھا
زمیں سے چاند کی جانب سفر کی بات نہ کر
زمیں سے حبس کا موسم تو ختم ہونے دے
ابھی ہوا سے مرے بال و پر کی بات نہ کر
خوشا کہ سر پہ کھلے آسمان کا سایہ
ہم ایسے خانہ بدوشوں سے گھر کی بات نہ کر
سلام اُن پہ جو گردن اُٹھا کے چلتے ہیں
جھکا ہوا ہے جو مقتل میں سر کی بات نہ کر
کہا تھا خواب میں باتش مجھے فرشتوں نے
ہمارا ذکر ہے جائز بشر کی بات نہ کر

دشمن بھی وہی اور وہی کرب و بلا ہے
کیا ریت کے دریا پہ کھڑا سوچ رہا ہے
پڑھ لے میری آنکھوں میں منقش ہیں دُعائیں
مجبور تہہِ سنگ مرا دستِ دُعا ہے
اے کاش کوئی ظلِ الٰہی کو بتا دے
خاموش سمندر کی خموشی بھی صدا ہے
کیونکر نہ اُگیں لالہ و گل میری زمیں پر
اس بار یہاں خون شہیدوں کا گرا ہے
آنکھیں ہیں اگر بند ذرا آنکھ ہی کھولو
کاغذ پہ لکھا لفظ حقیقت میں صدا ہے
حسرت سے رہِ شوق ہی اب دیکھیے باتش
پھر سوئے حرم قافلہ یاروں کا چلا ہے

سفر کی شام ترا بوجھ بانٹ سکتا ہوں
مرے نحیف سے شانوں پہ ایک سر تو ہے
کہاں سے روشنی آتی ہے چاند سورج کی
ہماری زیست کے گنبد میں کوئی در تو ہے
پناہ ظلِ الٰہی سے مانگتے کیوں ہو
ہمارے سر پہ شہنشاہِ بحر و بر تو ہے
اُجڑ گیا ہے وہ دشمن تو وار کیا کرنا
بھلے وہ آج بھی زندہ ہے دربدر تو ہے
لیا تھا نام کہ خوشبو زبان پر رکھ لی
تمہارے اسمِ گرامی میں کچھ اثر تو ہے
دیارِ غیر میں ہجرت کا فیصلہ کر لو
بدلتی رُت کی پرندوں کو اب خبر تو ہے
یہ سہمی سہمی ہوا بے سبب نہیں باتش
زمانہ مہر بلب ہے کسی کا ڈر تو ہے

حصار سنگ ہے اس میں کوئی سلطان رہتا ہے
میں کیسے مان لوں یارو یہاں انسان رہتا ہے
بس اتنا سوچ کے اُترو محبت کے سمندر میں
محبت کے سمندر میں سدا طوفان رہتا ہے
کھلے ہیں گھر کے دروازے چراغاں ہے منڈیروں پر
اُسے آنا نہیں پھر بھی یہی امکان رہتا ہے
کوئی کافر ہمارے دل کے اندر آ نہیں سکتا
ہماری دل کی بستی میں ابھی رحمان رہتا ہے
وفا سی چیز بھی تو مفت میں تقسیم کرتا ہوں
میں جو بھی کام کرتا ہوں مجھے نقصان رہتا ہے
مجھے احکام ملتے ہیں سمندر پار سے اکثر
مرا حاکم کسی کے تابع فرمان رہتا ہے
خیالِ یار زادِ راہ بن جائے اگر باتش
مسافر کے لیے مشکل سفر آسان رہتا ہے

کیا پوچھتے ہو درد پرانا اُسی کا تھا
میں ایک اور سارا زمانہ اُسی کا تھا
یوں بے سبب نہیں تھا مجھے ڈوبنے کا شوق
دریا کے آس پاس ٹھکانہ اُسی کا تھا
خوشیاں تمام اس طرح تقسیم ہو چکیں
گویا کہ شہر بھر میں گھرانہ اُسی کا تھا
ٹھہرا ہوا ہے بولتی آنکھوں میں رات دن
مت پوچھیے یہ خواب سہانا اُسی کا تھا
ہم تو لکیریں پیٹ کے جنگل سے آ گئے
سانپوں کی دسترس میں خزانہ اُسی کا تھا
باتش یہ زندگی کی حقیقت بھی کھل گئی
عنوان میں تھا سارا فسانہ اُسی کا تھا

ہماری آبلہ پائی کا یہ ثمر تو ہے
خوشا نصیب کہ صحرا میں اپنا گھر تو ہے

خوشی سے جیتے کے بازی جو ہار سکتے ہیں
وہ تاج و تخت پہ ٹھوکر بھی مار سکتے ہیں
تو اپنے شہر کے لوگوں کو ناتواں نہ سمجھ
گلے سے طوقِ غلامی اُتار سکتے ہیں
ہم انتظار کی گھڑیاں گنا نہیں کرتے
ترے فراق میں صدیاں گزار سکتے ہیں
یہ اور بات کہ ہونٹوں کو سی لیا ہم نے
تمہارا نام تو پھر بھی پکار سکتے ہیں
خدا کا شکر ہے ساحل پہ حبس ختم ہوا
ہوا چلی ہے سفینہ اُتار سکتے ہیں
ہمیں خبر ہے کہ شبنم کے چاندنی قطرے
چمن میں پھول کا چہرا نکھار سکتے ہیں

شاعری

زندگی تو ہی بتا تجھ کو گزاروں کیسے
زُلفِ افکارِ پریشاں کو سنواروں کیسے
میں وہ گل ہوں جسے شبنم کا نہیں لمس نصیب
خود کو مسموم فضاؤں میں نکھاروں کیسے
جبرِ حالات کے تالے ہیں مرے ہونٹوں پر
اے مرے دوست بتا تجھ کو پکاروں کیسے
کوئی دیتا ہے سہارا نہ تسلی نہ دُعا
غم کا یہ بارِ گراں دل سے اُتاروں کیسے
ناخدا کہتا ہے خود ڈوبنا جو چاہتا ہے
اُس سفینے کو میں دریا میں اُبھاروں کیسے
سخت حیراں ہوں کہ اک حرفِ صداقت پہ جلالؔ
ہو گئے دُشمنِ جاں لوگ ہزاروں کیسے

ڈاکٹر سیّد قاسم جلالؔ/ بہاولپور

کاغذ کی کشتی پر لکھا جب اِک بار سمندر
میرے تھا اس پار سمندر اور اُس پار سمندر
خشک زمیں ہوتی تو ننگے پاؤں چل کر آتا
تیرے میرے بیچ ہے لیکن اک دیوار سمندر
سونامی طوفان تباہی کرتا ہے پھر ہر سُو
جس دن ہم نے ہوتے دیکھا ہے بیدار سمندر
بھولے بھٹکے جا گرتے ہیں اس کی گود میں دریا
صدیوں سے ہم دیکھ رہے ہیں خودمختار سمندر
تیری جھیل سی آنکھوں میں، میں ڈوبنے سے ڈرتا ہوں
ورنہ میرے آگے کیا ہیں یہ دوچار سمندر
یارب تیری عظمت کے ہیں یہ تو شاہد سارے
جنگل، نگری، صحرا، دریا اور کہسار، سمندر
اس میں بھی اک دنیا ہے آباد غزالیؔ دیکھی
پھر ہم اس کو کیسے کہہ دیں ہے بیکار سمندر

غزالیؔ/گوجرہ

پھیلتا ہی جا رہا ہے نفرتوں کا سلسلہ
ختم ہوگا کب کہاں یہ سازشوں کا سلسلہ
پھول مہکیں رنگ بکھریں وہ جہاں رکھے قدم
ایک جس نے کر دیا چاروں رُتوں کا سلسلہ
نام دے کر تو حنا کا میرے دل کے خون کو
دے رہا ہے آرزو کو حسرتوں کا سلسلہ
دیکھنے کو پھر ملیں گی آنکھ کو حیرانیاں
تھم گیا یارو اگر یہ بارشوں کا سلسلہ
اُس کے رستے میں بچھاتا ہی رہوں گا میں نظر
جب تلک جاری رہے گا دھڑکنوں کا سلسلہ
عشق کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے دوستو
بس ہجومِ رنج و غم اور رتجگوں کا سلسلہ
اُس نے بوسہ کیا لیا شاہدؔ مری تصویر کا
آ گیا ہے میرے گھر تک خوشبوؤں کا سلسلہ

ہمایوں پرویز شاہدؔ/ لاہور

سامنے تیرے میری جاں پہ بنی رہتی ہے
اور پلکوں پہ وہ تاروں کی جھڑی رہتی ہے
اک شبہ آنکھ میں ہے اور ہے اک سینے میں
دل کو دھڑکا ہے کہ آواز دبی رہتی ہے
اک تکلم ہے کہ اٹکا ہے میرے ہونٹوں پر
دیکھ کے جس کو بہاروں میں نمی رہتی ہے
لفظ کیا میر کا دیوان تیری آنکھوں پر
جائے قربان اگر تجھ میں کمی رہتی ہے
کوئی ملنے کا سبب بھی ہو مگر پھر نہ ملیں
ہجر کی شاخ بہرطور ہری رہتی ہے
گزرے لمحوں کا پتہ آج بھی کرتے ہو کنولؔ
وقتِ رُخصت جنہیں ملنے کی غمی رہتی ہے

آسناتھ کنولؔ/لاہور

خاکداں آسمان تھوڑی ہے؟
اور یہ جائے امان تھوڑی ہے؟
اس وطن کو یونہی نگل لو گے
یہ بنارس کا پان تھوڑی ہے؟
دونوں ہاتھوں سے چیر ڈالو گے
دل ہے کپڑے کا تھان تھوڑی ہے
اپنی خواہش سمیٹ لو لڑکی
اب یہاں شہ جہان تھوڑی ہے
یہ جو تقریر کر رہا ہے تو
تیری اپنی زبان تھوڑی ہے
روز جھمکے کہاں سے بھیجوں میں
میری سونے کی کان تھوڑی ہے؟
پھوڑ دیتی ہے چوک پر بھانڈا
زندگی رازدان تھوڑی ہے؟

راؤ وحید اسد/ملتان

یوں ہے کہ پہلی بار بھی ٹالا، پرے کیا
میں پھر گیا تو اس نے دوبارہ پرے کیا

جب میں قریب جانے لگا کچھ زیادہ ہی
تو اس نے مجھ کو اور زیادہ پرے کیا
جتنا جا سکتا تھا میں گیا اور تم نے بھی
جتنا ہو سکتا تھا مجھے اتنا پرے کیا
اک بوجھ اُٹھائے پھرتا رہا کافی عرصہ، اور
پھر ایک دن اسے جو اُتارا، پرے کیا
میں سب سے پہلے جاتا اور آخر میں آتا تھا
تنگ آ کے اس نے مجھ کو نکالا، پرے کیا
روکا گیا ہے ایک جگہ سے تو کیا ہوا
ہٹ کے وہاں سے میں نے بھی تھوڑا پرے کیا
اب تھوڑا سا بھی ہو کہیں تو کھینچتے ہیں، اور
وہ دن بھی تھے کہ سارے کا سارا پرے کیا
اس سے زیادہ دے رہا تھا جتنا بنتا تھا
پر ہم نے اپنا رکھا، بقایا پرے کیا
ہم کس شمار میں ہوں گے خود سوچ لیجیے
اس نے وہاں جب اچھے سے اچھا پرے کیا
پہلے سے بھی زیادہ میرے پیچھے آیا پھر
گُل اس کو اپنے آپ سے جتنا پرے کیا

گل فراز/ہڈالی

خواب بکھرنے لگتے ہیں

اس بار پیا جب آئے تو
کچھ بدلی بدلی تھی رنگت
اور آنکھوں میں ویرانی تھی
وہ شوخ شریر جو چنچل تھی
کیا جانے کیوں بیگانی تھی
اس بار وہ ہونٹ جو دیکھے تو
احساس ہوا دکھیا من کو
جب خواب بکھرنے لگتے ہیں

چہرے بھی بدلنے لگتے ہیں

عامر بن علی/جاپان

چشمِ نمناک پہ رکھ دینا تھا
آگ کو خاک پہ رکھ دینا تھا
کوئی چہرہ تو مجھے مل جاتا
تو نے بس چاک پہ رکھ دینا تھا
کوئی تو جگنو، کوئی تارا ہی
میری پوشاک پہ رکھ دینا تھا
اپنے پیروں میں جگہ دینی تھی
مجھ کو افلاک پہ رکھ دینا تھا
حیرتی آنکھ کا لمحہ کوئی
حدِ ادراک پہ رکھ دینا تھا

لبنیٰ صفدر/لاہور

چلتے چلتے گہرے پانی میں اُتر جاتا ہوں میں
روکتا رہتا ہے کوئی اور مر جاتا ہوں میں
پھول بن کر کھلتا ہوں نادیدہ خطے میں کہیں
اور کسی انجان رستے میں بکھر جاتا ہوں میں
چاند اُڑتا رہتا ہے مجھ پر کبوتر کی طرح
کہکشاؤں سے گزرتا اپنے گھر جاتا ہوں میں
اجنبی دیسوں میں دونوں ملتے ہیں صدیوں کے بعد
ہاتھ اُس کا تھام کر جانے کدھر جاتا ہوں میں
میں نے پانی پر بنا رکھی ہیں تصویریں کئی
پھول جب تالاب میں گرتا ہے ڈر جاتا ہوں میں
کتنا ہوتا ہے سہانا اس کی آنکھوں کا سفر
کیسے کیسے دشت و دریا پار کر جاتا ہوں میں
اب بھی ہے وہ پیڑ قصبے کی حویلی میں حسن
جس کے نیچے جا کے بیٹھوں تو سنور جاتا ہوں میں

حسن عباسی/لاہور

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	140/- روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	350/- روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	200/- روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	200/- روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	700/- روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	150/- روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	700/- روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	800/- روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	200/- روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	400/- روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	300/- روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	500/- روپے

ناشر: القمر انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

امریکیات

فقیر اللہ خاں

امریکہ میں اتوار کی صبح جب سسکیاں بھرتی بیدار ہوتی ہے تو سڑکوں، شاہراہوں پر ایک ہو کا عالم طاری ہوتا ہے۔ اکا دکا کہیں کوئی گاڑی نظر آ بھی جائے تو اس کا رُخ ساحلِ سمندر کی طرف ہوتا ہے یا قریبی پہاڑ کی طرف۔ گاڑی چلانے والا نیکر اور جیکٹ پہنے اپنے موڈ میں رواں دواں ہوتا ہے۔ گاڑی کے پیچھے ٹرالر میں بوٹ (کشتی) رکھی ہوتی ہے جس پر مچھلیاں پکڑنے والا سامان ہوتا ہے۔ کسی گاڑی کے پیچھے چلتا پھرتا گھر ہو تو اس کا مطلب واضح ہے کہ ڈرائیور کا رُخ پہاڑوں کی طرف ہے۔

یوں تو ہفتہ اور اتوار کے دن پورے ملک میں ویک اینڈ کا سماں ہوتا ہے۔ ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات اُن کے لیے عیش ونشاط کی رات ہوتی ہے۔ فلمیں دیکھنے، رقص وسرود کی محفلیں سجانے، جوئے خانوں میں ڈالروں کی بارش کرنے میں یہ رات بیت جاتی ہے۔ یہ امریکی دو تہائی رات گزرنے کے بعد اپنے ٹھکانوں میں اس طرح لوٹتے ہیں جیسے کوئی پرندہ شام کو اپنے گھونسلے کی طرف محوِ پرواز ہوتا ہے۔ اتوار کی صبح کس نے دیکھی ہے؟ کوئی دوپہر بارہ بجے آنکھ کھلتی ہے تو پیٹ میں بھاگتے چوہوں کی خوراک کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد سڑکوں پر رونق شروع ہو جاتی ہے اور امریکہ میں زندگی اپنے معمول کی طرف لوٹ آتی ہے۔

امریکہ میں ماہانہ تنخواہ کا 'رواج' نہیں ہے۔ ہر ملازم کو ہفتہ کے آخر میں جمعرات کی شام تک پورے ہفتہ کی تنخواہ مل جاتی ہے۔ تنخواہ کا چیک وصول کرنے کے بعد ہر امریکی اپنے وقت کا 'بادشاہ' ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بدھ کی شام 'بادشاہ لوگ' تہی دامن اور کنگال ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ راقم نے دیکھا ہے کہ سگریٹ بھی اُدھار مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

امریکیوں کا وطیرہ ہے کہ وہ ہفتہ وار تنخواہ اُسی ہفتہ ہضم کر جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب اگلا ہفتہ آئے گا، دیکھا جائے گا۔ اس کے برعکس ہمارے معاشرے میں عموماً والدین کو یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ بچوں کو بہتر تعلیم کیسے دلوائی ہے۔ بچے بڑے ہوں تو ان کی شادی بیاہ کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا۔ اپنا پیٹ کاٹ کر کچھ بچائیں گے تو پیسہ اکٹھا ہوگا اور وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں گے۔ امریکیوں کو اس طرح کا کوئی غم نہیں اور نہ اتنے جھنجھٹ ہیں جو ہم نے پالے ہوئے ہیں۔

امریکہ میں لمبی لمبی کاریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ گھر کے ہر بالغ فرد کے پاس عموماً دو دروازوں والی اپنی گاڑی ہوتی ہے۔ وہاں پر گاڑی، فلیٹ، گھر آپ بیس تیس سال کی لیز (قسطوں) پر لے لیں۔ آپ کی اپنی گاڑی ہے، اپنا فلیٹ ہے اور آرام سے بیس تیس سالوں میں مقررہ اقساط ادا کرتے رہیں۔ امریکہ میں اگر آپ کا کریڈٹ (اعتماد) بہتر ہے تو آپ کسی بھی جگہ سے کوئی بھی چیز خرید سکتے ہیں۔ ٹی وی، فریج، گاڑی یا فلیٹ کوئی مسئلہ نہیں، لیکن اگر آپ کا کریڈٹ قابلِ بھروسہ نہیں تو پھر جگہ جگہ آپ کے لیے مشکلات کھڑی ہوں گی۔ آپ کہیں بھی کسی گروسری سٹور سے سامان خریدیں، کاؤنٹر پر اپنا کریڈٹ کارڈ پیش کریں اور بس آرام سے سامان اپنی گاڑی میں رکھیں اور گھر چلے جائیں۔ سارے امریکہ میں کاروبار صرف 'اعتماد' پر ہی چلتا ہے۔ کرنسی نوٹ بھی کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے، یہ بھی ایک اعتماد کا نام ہے۔ ہزاروں، لاکھوں ڈالروں سے بیگ اور جیبیں بھر کر رقم اُٹھانے کی ضرورت نہیں، اس کے بدلے اگر کریڈٹ کارڈ جیب میں ہے تو پورا امریکہ خرید لیں۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ امریکہ میں غربت نام کی کوئی شے نہیں۔ راقم نے کوڑے کے ڈرموں سے لوگوں کو خوراک تلاش کرتے دیکھا ہے۔ کلبوں کے باہر پارکنگ لاٹ میں صبح صبح شراب کی خالی بوتلیں اور ٹین کے خالی ڈبے بھی اُٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ امریکہ میں ہر طرح اور ہر سوسائٹی کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ آدھی رات کے وقت گلیوں اور سڑکوں میں شراب میں مدہوش لوگوں کو غل غپاڑہ کرتے دیکھا ہے۔ بند سٹوروں کے دروازوں کو ٹھڈے مارتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

قانون بنا موم کی ناک:

کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں قانون کی عملداری ہے۔ کہیں کہیں تو یہی قانون موم کی ناک دکھائی دیتا ہے۔ قانون کے مطابق 18 سال سے کم عمر کے لڑکے یا لڑکی کو تمباکو کی مصنوعات (سگریٹ وغیرہ) بیچنا منع ہے۔ بیچنے والے پر لازم ہے کہ عمر کی تصدیق کے لیے سگریٹ خریدنے والے سے شناختی کارڈ (آئی ڈی) دریافت کرے اور عمر اٹھارہ سال یا اُس سے زائد ثابت ہونے پر سگریٹ وغیرہ فروخت کرے۔ اگر دکاندار کم عمر والے کو فروخت کرتا ہوا پکڑا جائے تو بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اکیس سال سے کم عمر لڑکے یا لڑکی کو الکحل (شراب) بیچنا بھی منع ہے۔ اگر کوئی پوری عمر (Adult) والا جو اٹھارہ سال یا اکیس سال سے زائد عمر کا ہو وہ وہی سگریٹ یا الکحل سٹور سے خرید کر اس نوجوان لڑکے یا لڑکی کو پینے کے لیے دے دے، جس کو فروخت کرنے پر پابندی ہے تو کوئی گرفت نہیں۔ اس موقع پر قانون خاموش ہے۔ کیا یہ قانون کے خلاف کھلا مذاق نہیں۔ یہ سب کچھ

امریکہ میں ہو رہا ہے۔

امریکہ میں صفائی ستھرائی پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ یہ دیکھنے میں بھی آتی ہے۔ اس کے باوجود امریکہ کے جن جن شہروں میں کالوں کی کثیر تعداد رہتی ہے وہاں پر پبلک مقامات پر صفائی کا فقدان نظر آتا ہے۔ نیویارک جیسے شہر میں میٹرو ٹرین کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ جہاں جہاں سے گزرتی ہے پٹڑیوں کے اطراف گندگی اور ٹین کے ڈبے جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ بس سٹاپوں اور میٹرو سٹیشنوں کے اطراف چیونگم کے نشانات ہمارے ملک میں مکھیوں کی طرح نظر آئیں گے۔ اس میں کوئی اصول یا اخلاقی فرض مدِنظر نہیں رکھا جاتا۔ امریکہ میں ماحول کو گندہ کرنے اور رکھنے میں نیگروز (کالے لوگوں) کا کافی ہاتھ ہے۔ حالانکہ کالے لوگوں کو بھی گورے لوگوں کے برابر درجہ حاصل ہے۔ ملک میں سب برابر کے حصہ دار ہیں۔ اس کے باوجود کالے لوگ اپنے ملک کی سرزمین سے سوتیلوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ امریکہ میں جہاں جرائم میں کالے لوگ ایک نمبر پر ہیں وہاں کھیلوں میں 'کالوں' کا پہلا نمبر ہے۔ ملکی بین الملکی اور اولمپک کھیلوں میں زیادہ سے زیادہ میڈلز (تمغے) جیتنے کا اعزاز بھی کالوں کو ہی حاصل ہے۔ کھیل میں اپنے ملک کی خاطر اپنی جان لڑا دیں گے۔ اسی لیے امریکہ میں ان کے چاہنے والوں (فینز Fans) کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے۔ امریکہ کے لوگ اپنے کھلاڑیوں سے بہت پیار اور محبت کرتے ہیں۔ سٹیڈیم میں جا کر یا ٹی وی سکرین کے سامنے بیٹھے اپنے کھلاڑی کو سپورٹ کرتے ہیں خواہ وہ کھلاڑی گورا ہو یا کالا۔

تعلیم کی اہمیت:

امریکہ میں بچوں کے لیے ہائر سیکنڈری (بارہویں کلاس) تک تعلیم نہ صرف مفت بلکہ لازمی ہے۔ پورے امریکہ میں کوئی بچہ ریستورانوں میں میزیں صاف کرتا ہوا یا آٹو مکینکوں کی ورکشاپس پر کوئی 'چھوٹا' نظر نہیں آئے گا۔ بچے کو گھر میں بٹھانے کا تصور بھی نہیں۔ ایک مقررہ جگہ پر (پوائنٹ) سکول کی بس آ کر رُکے گی۔ بچے اس میں سوار ہو جائیں گے۔ سارے امریکہ میں سکول کی بسوں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ ہر سکول کی اپنی اپنی بسیں ہیں جن کے اطراف سکول کا نام لکھا ہوتا ہے۔ بچوں کو سوار کرواتے یا اُتارتے وقت بس کا ڈرائیور بس کے دونوں اطراف سرخ بتی کے علاوہ خودکار تختیاں آویزاں کرے گا جن پر لکھا ہوگا سٹاپ "Stop"۔ اس کے بعد سامنے سے آنے والی اور پیچھے سے آگے روانہ ہونے والی گاڑیاں اُسی جگہ رُک جائیں گی۔ بچہ اُترے گا، سڑک عبور کرے گا تو پھر بس کا ڈرائیور 'سٹاپ' والی دونوں اطراف کی تختیاں فولڈ کر دے گا تو پھر ساری ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں ہو جائے گی۔ سکول میں بچوں کو کتابیں اور لنچ باکس حکومت کی طرف سے مفت فراہم کیے جاتے ہیں۔ بارہویں کلاس (ہائر ایجوکیشن) کے خاتمہ پر سکول میں باقاعدہ Ceremony ہوتی ہے جس میں بچوں کے والدین کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ ہونہار طلبا کو انعامات و اسناد بھی دی جاتی ہیں۔ یہ دن کسی بھی انسان کے لیے بڑا خوشگوار دن تصور کیا جاتا ہے۔

تین ڈبلیو:

امریکہ میں یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ تین ڈبلیو W کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یعنی ان تینوں ڈبلیو کا امریکہ میں اعتماد کیا ہی نہیں جا سکتا۔

یہاں موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ پیش گوئی تو کی جا سکتی ہے لیکن کسی وقت موسم کا مزاج بدل جائے تو چنداں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تک کہ سارے امریکہ میں موسم کے متعلق آگاہ کرنے کے لیے خصوصی Weather Channel موجود ہے۔ لوگ بھی اس چینل کے اتنے عادی ہو چکے ہیں یہاں تک کہ باتھ روم میں بھی ویدر چینل کی نشریات سننے کا انتظام موجود ہے۔ نہانے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ آنے والے موسم کی رنگینیوں اور سنگینیوں سے بھی اپنے آپ کو آگاہ رکھیں۔

دوسرے ڈبلیو کا مطلب ہے woman یعنی بیوی۔ بیوی کسی بھی وقت اپنے جیون ساتھی کو "داغِ مفارقت" دے سکتی ہے۔ یہاں پر کوئی رسم و رواج کی پابندی نہیں۔ بچوں کو یا خاوند کو چھوڑتے وقت معاشرہ یا عزیز و اقارب کیا کہیں گے، اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ آج گھر میں گھر کی مالکہ کون ہے؟ اُسی گھر میں چند دن یا ہفتہ بعد مالکن بدل بھی سکتی ہے۔ نہ جانے بیوی کا خاوند سے کب دل بھر جائے تو صبح کا انتظار کیے بغیر ہی 'خدا حافظ' کہہ کر چلتی بنے۔

تیسرے ڈبلیو کا مطلب ہے 'ورک Work' یعنی کام۔ کوئی بھی ادارہ اپنے ملازم کو کسی بھی وقت ملازمت سے برخاست کر سکتا ہے یا اگر ملازم کو کہیں سے بہتر آفر مل جائے تو وہ ادارے کو جب چاہے خدا حافظ کہہ سکتا ہے۔

اس لیے کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں تین "W W W" کا کوئی اعتبار نہیں یعنی دوسرے لفظوں میں "You can't rely"۔ اس لیے اگر آپ کا مستقبل قریب میں امریکہ شفٹ ہونے کا ارادہ ہے تو ذہنی طور پر ان تینوں 'W' سے ہوشیار رہیں۔ اگر آپ نے اپنے آپ کو ان تینوں W کے حوالے کر دیا تو پھر آپ امریکہ میں Rolling Stone بن جائیں گے اور آپ کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملے گا۔

دُنیا میری نظر میں

عامر بن علی

جرمنی سے تعلق رکھنے والے عالمی شہرت یافتہ سفرنامہ نگار جینو، جن کا امریکہ کے متعلق تحریر کردہ سفرنامہ انٹرنیشنل بیسٹ سیلرز میں شمار ہوتا ہے۔اور لیتھونیا سے تعلق رکھنے والی میری دوست مصنفہ ڈاکٹر دالیاسٹاپاکوٹی کا چند برس قبل ''ارژنگ'' کے لئے انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔میرا ان سے سوال تھا کہ کیا سفرنامہ فکشن ہے؟ دونوں مصنفین کا جواب اثبات میں تھا۔مزید ڈاکٹر دالیا کا کہنا تھا کہ اگر سفرنامے سے کہانی کا عنصر نکال دیا جائے تو وہ محض گائیڈ بک بن کر رہ جائے گا۔فقط حقیقت نگاری کسی سفر کی روداد کا اچھا بنانے کے لئے ناکافی ہے۔نیز سفرنامے کی خوبصورتی یہی ہے کہ اس میں ادب کی تمام اصناف سما سکتی ہیں۔اردو سفرنامے کا مسئلہ یہ ہے کہ عمومی طور پر یہ مسافرنامہ ہوتا ہے۔سفرنامہ نگار کا ہیرو ہونا بھی ہمیں گوارا ہے مگر کردہ ونا کردہ گناہوں کا بیان اور سینے میں دبی ہوئی سفلی خواہشات کو واقعات بنا کر پیش کرنا قارئین پر گراں گزرتا ہے۔

میرے اکثر سفرنامہ نگار دوست کتاب کی فروخت بڑھانے کے لئے اپنے اوپر بے جا بہتان طرازی کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ایسے ماحول میں ناصر ناکاگاوا کا سفرنامہ'' دنیا میری نظر میں'' تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔یہ سفر کے تجربات کو اچھوتے اور بالکل منفرد انداز میں پیش کرتا ہے۔بلاشبہ ثبات مسافر کو نہیں، سفر کو حاصل ہے، محسوس ہوتا ہے کہ ناصر ناکاگاوا نے اس حقیقت کو پالیا ہے۔اسی سبب سے اس کتاب میں آپ کو ناظر کم اور منظر زیادہ تر دکھائی دے گا۔'' دنیا میری نظر میں'' مصنف کا دوسرا سفرنامہ ہے۔اس سفر نامے میں آپ کو وہ تمام خوبیاں نظر آئیں گی۔جو ان کے پہلے سفرنامے'' دیس بنا پردیس'' میں پائی جاتی ہیں۔پہلی ملاقات میں ناصر ناکاگاوا کے بارے میں میرا یہ تاثر قائم ہوا کہ وہ ایک انتہائی مہذب، حساس، نرم خو اور انسان دوست شخص ہیں، جب ان کی تحریروں کے مطالعے کا موقع ملا تو ان کی شخصیت کی مذکورہ خوبیاں ان کی تحاریر میں بھی جا بجا نظر آئیں۔جاپان میں رہتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ اپنے ہم وطن پاکستانیوں کی علمی اعتبار سے مدد کی ہے۔ان کی قائم کردہ ویب سائیٹ اردو نیٹ نہ صرف جاپان میں مقیم پاکستانیوں کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کررہی ہے۔بلکہ اردو زبان کی ترویج کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔میرے مربی باباجی اشفاق احمد اکثر دعا دیا کرتے تھے کہ'' اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطاء فرمائے'' اس اعتبار سے میں ناصر ناکاگاوا کے سفرنامے کو ایک صدقہ جاریہ سمجھتا ہوں، کہ اس کے مطالعے سے بہت سارے پاکستانی تارکین وطن کو فائدہ پہنچے گا۔اردو ادب میں جہاں خود نمائی کے نقطہ نظر سے لکھے گئے سفرناموں کی بھرمار ہے، وہاں'' دنیا میری نظر میں'' ایک منارہ نور اور روشن مثال ہے، کہ سفرنامے کو انسانیت کے مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔ ڈیڑھ صدی پیشتر سرسید احمد خاں کے لندن سے متعلق تحریر کئے گئے سفرنامے سے ہوتے ہوئے حکیم محمد سعید کی جاپان کے سفر سے متعلق لکھی گئی روداد اور عہد موجود تک بہت ساری اچھی مثالیں بھی اس بابت موجود ہیں، جن مصنفین نے نیکی کے جذبے کے تحت اپنے سفر کے تجربات و تاثرات کو قلم بند کیا۔متمع نظریہ تھا کہ بعد میں آنے والے مسافروں کا بھلا ہو سکے۔یہ سفرنامہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

'' دنیا میری نظر میں'' میں شامل اکثر تحریریں اردو نیٹ جاپان کے پلیٹ فارم سے قارئین تک پہنچتی رہی ہیں۔ان تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کروانا قابلِ تحسین عمل ہے۔شاہ صاحب کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے جاپان میں ربع صدی گزاری اور اس سماج کا گہرائی میں مشاہدہ، مطالعہ کیا ہے۔علاوہ ازیں انہیں جاپانی زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔یہاں مقیم پاکستانی کیمونٹی میں شاید ہی دو، چار فیصد لوگ اتنی اچھی جاپانی زبان جانتے ہوں گے، جتنی مہارت مصنف کو حاصل ہے۔زبان کسی بھی ثقافت کا DNA ہوتی ہے۔جتنی بہتر آپ زبان جانتے ہوں گے، اتنے ہی اچھے انداز میں آپ اس قوم اور اس کی معاشرت کو سمجھ سکیں گے۔ ناصر ناکاگاوا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوصف، اکثر تارکین وطن سے متعلق جاپانی قوانین آسان اردو زبان میں سمجھانے کی تحریری سعی کرتے رہتے ہیں۔'' دنیا میری نظر میں'' کے مطالعے کے بعد یہی عرض کروں گا کہ بیان چاہے جاپان کا ہے یا پھر کسی اور دیس کے متعلق، ناصر ناکاگاوا کی نظر سے دیکھنے پر دنیا اور زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے۔خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے، انتہائی اعلیٰ طباعت، آفسٹ پیپر، اور قیمت بھی اس مہنگائی کے دور میں مناسب ہے۔پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے اچھے کتب خانوں پر باآسانی دستیاب ہے۔جو احباب خصوصاً جاپان کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میرا انہیں مشورہ ہے کہ یہ کتاب ضرور پڑھیں۔

خط وکتابت

ڈاکٹر سیّد سلیمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

گھر سے چار سو کلو میٹر دور ہاسٹل میں رہنا کاردارد تھا۔ کبھی کبھار گھر سے خط آتا تو خوشی ہوتی اور حالات سے آگاہی بھی۔ یہ بہت سال پہلے کی بات ہے جب موبائل، انٹرنیٹ، لیپ ٹاپ اور ٹیبلٹ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ پی ٹی سی ایل ہی اک بات کا ذریعہ تھا۔ وہ بھی دور دراز سے بات کرنے یا کروانے کا متحمل نہ تھا۔ خط آئے تو بیقراری یقینی ہوا کرتی تھی۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے اسی لئے والدہ مرحومہ سے کہا تھا:

کس کو ہوگا اب وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار

محبت سے لکھے گئے خطوط سنبھال لئے جاتے تھے۔ ان میں گلاب کے پھول سوکھ کر کانٹا ہو جاتے مگر شاعر اور محبت کرنے والا دل زبان حال سے پکار اٹھتا تھا کہ اتنا عرصہ بیت گیا ہے:

آج تک تیرے خطوں سے تیری خوشبو نہ گئی

رسم وراہ ان دنوں خطوط کی مرہون منت ہوا کرتی تھی۔ اس سے بہت پہلے غالب کے خطوط بھی تو تھے جنہوں نے چپکے چپکے جنگ آزادی کے بعد کی ساری روداد دلی سے باہر بھجوا دی۔ غالب تو دنیاوی محبت میں کہا کرتے تھے کہ کوئی انہیں خط لکھوانا چاہے تو ہم سے لکھوائے تو ایسا ہوگا کہ:

ادھر صبح ہوئی اور کان پر رکھ کر قلم نکلے

تعلق خطوط ہی کے ذریعے بنا کرتا تھا، استوار رہا کرتا تھا اور انہی کے ذریعے بگڑا کرتا تھا۔ محبت میں جذبات میں لکھے گئے خط بعض اوقات تعلق میں سردمہری آجائے تو واپس بھی مانگ لئے جاتے تھے یا جلا دیئے جاتے تھے۔ ہمارے معروف شاعر اعزاز احمد آذر مرحوم کا شعر ہے:

وہ رسم وراہ ہی نہیں تو پھر یہ اثاثے کس کام کے تمہارے
کبھی جو گذرا ادھر سے لے لوں گا تم میرے خط نکال رکھنا

آج اک آخری خط کا تذکرہ مقصود ہے حال ہی میں میرے ابو رحلت فرما گئے۔ دل کی بات تو بس انہی سے کی جاتی تھی، ان کے جانے کے بعد زندگی میں اک ایسی کمی آگئی کہ جس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہ تھی، ابھی کل رات ہی ایسا لگا کہ انہوں نے اُخروی حیات سے مجھے اک محبت نامہ ارسال کیا ہے۔ میں چشم تصور سے اسے پڑھ رہا تھا، جو کچھ یوں تھا۔

دار الجزاء

برزخی زندگی تو ارخ سے بے نیاز ہے

پیارے سلیمانی (ابا جی پیار سے یہی نام بلایا کرتے تھے)

السلام علیکم: میری جان اب میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو سب لوگ میری جی جان سے خدمت کر رہے تھے۔ خصوصاً تمہاری بیوی کہ وہ بھی میری بیٹی ہی کی طرح ہمارے گھر میں آئی، میری بھتیجی جو تھی میں ان دنوں خود کو بے دست وپا محسوس کر رہا تھا، تم یونہی مذاق مذاق میں کہا کرتے تھے کہ "ابا جی! یہ جو آپ نے خود ساختہ حفظان صحت کے اصول بنائے ہوئے ہیں میری ایم بی بی ایس کی کتابوں میں کہیں لکھے ہوئے نہیں ملتے؟" مگر میں تمہیں حقیقت بتاؤں انہی اصولوں کی وجہ سے رب کریم نے زندگی کی 86 بہاریں دکھائیں۔ تم سے جدا ہونے سے اک روز پہلے مجھے سینے میں بہت جلن تھی تم نے جو ٹھنڈی بوتل پلائی تو کچھ افاقہ ہوا حالانکہ میں تمہیں اکثر کہا کرتا تھا۔

"یار ڈاکٹر تو تم ہوا ایسا مجھے کہنا تو نہیں چاہئے ٹھنڈی بوتل اور سموسے نقصان دہ ہوتے ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ میری جدائی پر تم سب رنجیدہ ہو گے اور تمہیں تو بہت ہی دکھ ہوگا۔ تمہارے نینا چھم چھم برسیں گے مگر میں جب صاحب فراش ہوا تو دل نے کہا موت کی دھمکی زندگی کی نئی راہوں کو کھول دیتی ہے۔ میں نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ ایک روز بعد مجھے بڑی غنودگی سی رہی پھر اگلے روز مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمان ومکان کی حدیں ختم ہوگئی ہوں۔ میں حد نگاہ سے بھی پرے دیکھ سکتا تھا۔ جغرافیائی حدود اب میرے لئے بے معنی تھی، مجھے پتہ چل گیا کہ جن منازل کی مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاندہی کی تھی انہیں منازل کا ہو بہو اب مجھے سامنا تھا، میں زندگی میں بارہا Aternity یعنی زندگی بعد از موت کے بارے سوچا کرتا تھا۔ اب مجھے اک حقیقی ہمیشہ ہمیشہ والی زندگی نظر آرہی تھی تم اور دوست احباب تو مجھے منوں مٹی تلے دبا کر رخصت ہو گئے مگر تم لوگ میرے دوسرے بچے اور میری بیٹی جو میرے لئے دعا

کرتے رہے کہ (رب ارحم......) اے اللہ ہمارے ماں باپ پر رحم فرما جیسے انہوں نے شیر خوارگی کے زمانے میں جب ہم بے دست و پا تھے ہم پر کرم کیا۔ اس کی وجہ سے مجھے قبر میں آسانی رہی۔

اور ہاں! مجھے یاد آیا جب تم چھوٹے تھے تو ہمارے غریب پڑوسیوں کا اک لڑکا جو تمہارا کلاس فیلو تھا ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ ہمارے گھر طلباء ٹیوشن پڑھنے آتے تھے مگر میں اس سے فیس نہیں لیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے میری قبر کے اک کونے سے نرم اور خوشگوار سی روشنی پھوٹتی ہے۔ ظاہر ہے میری جسمانی آنکھیں تو اب ہیں نہیں مگر میں اپنی روحانی آنکھوں سے وہ روشنی دیکھتا ہوں۔ میں جو اپنی مسجد میں صبح بے لوث درس دیا کرتا تھا اس کی وجہ سے اکثر میری قبر کے اک طرف سے کھڑکی سی کھلتی ہے جس میں سے بڑی خوشبودار ہوا آتی ہے۔ تم بھی اپنے بھائی بہنوں سے صرف رب کی رضا کیلئے اور صلہ رحمی کی نیت سے اچھا سلوک کیا کرو۔ میں اب یہاں دیکھ رہا ہوں کہ صدقہ کس طرح قبر میں حفاظت کرتا ہے۔ اس لئے واقعتاً اک ہاتھ سے اس طرح دیا کرو کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو پھر اس کا دکھلاوا نہ کرنا بس جسے دو اسے پتہ ہو یا تمہارے رب کریم کو پتہ ہو بلکہ یار میں تو کہتا ہوں صرف رب ہی کو پتہ ہو مگر کیسے؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جیسے ہمارے گاؤں والے صوفی محمدؐ تھے وہی جو دوکاندار تھے غرباء کے سودا سلف میں پیسے رکھ دیا کرتے تھے کہ غریب شخص شرمندہ بھی نہ ہو، دکھلاوا بھی نہ ہو اور صدقہ بھی قبول ہو جائے۔ تم جانتے ہو کہ گاہک انہیں واپس آ کر کہا کرتے تھے۔

''صوفی جی آپ کے پیسے شاید سودے میں ہی رہ گئے؟'' تو وہ مسکرا کر کہتے ''بھائی تم ہی ان پیسوں کے بارے میں بتا رہے ہو تمہارے ہی ہوں گے۔''

سلیمانی میں نے عمر بھر کوشش کی کہ اپنے بچوں کو رزق حلال کھلاؤں پھر انسان خطاء ہی خطاء ہے اور رب عطاء ہی عطاء ہے۔ اس نے اتنا کرم کیا کہ میں جو چھوٹی چھوٹی نیکیاں اس کی محبت میں کیا کرتا تھا انہی کی وجہ سے راضی ہو گیا اس لئے تمہیں یہی کہنا مقصود ہے کہ دیکھو جو تمہارے پاس ابھی مہلت ہے کسی بھی نیکی کو چھوٹا نہ سمجھنا، ہوسکتا ہے کسی ایسی ہی چھوٹی موٹی بات سے تیرا بیڑا پار ہو جائے، کسی مفلس مریض کی آہ و بکا سن کر اس کی خدمت کرنے پر کسی مفلس کی تھوڑی سی مدد کرنے پر تمہاری یہ منازل آسان ہو جائیں جو میں یہاں دیکھ رہا ہوں بیٹا یہ تو دارالجزاء ہے، میں اب چاہوں بھی تو کوئی نیکی نہیں کر سکتا جبکہ تم ابھی دارالعمل میں ہو، تمہیں یہاں آنا تو ہے ہی اس کی جتنی بھی تیاری ہو سکے کرلو، یہاں آسانی رہے گی۔ زندگی میں بھی اور اب بھی میری خواہش ہے کہ بڑے بھائی اور چھوٹی بہن سے ان دونوں کے بچوں سے سب سے حسن سلوک کرنا، اپنا حق دبا کر ان کے حقوق ادا کرو کہ میری جان جنت حقوق کی قربانی کا نام ہے، حقوق مانگنے کا نام نہیں۔

والسلام...... تمہارا ابو

تصور کے کانوں سے میں نے ابا جی کی باتیں سنیں تو جی بھر آیا۔ میں نے سوچا اگر میں ان کے دارالجزاء سے لکھے گئے خط کا جواب دوں تو کچھ اس طرح سے ہی ہوگا۔

دارالعمل

اگست 2017ء

پیارے ابا جی۔ السلام علیکم: برزخی زندگی سے آپ کا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ اب جو منازل آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں ان کے لئے مجھے یہاں اس دنیا میں ایمان بالغیب کی اشد ضرورت ہے کہ قیمت تو ایمان بالغیب ہی کی ہے۔ سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ نے اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ جبرائیل دکھائیں تو مانتے ہیں اسی لئے وہ صدیق بنے۔ حضرت عائشہؓ کے بستر پر وحی نازل ہوتی تھی مگر اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کو غیر ہوتا، انہیں پسینے میں شرابور ہوتا تو وہ دیکھ سکتی تھیں۔ ان کا رنگ مبارک زرد ہوتا تو دیکھ سکتیں کہ وحی اتر رہی ہے مگر ان کے ایمان بالغیب ہی کی وجہ سے قرآن کریم کی آیات ان کی برات میں نازل ہوئیں۔ میرے پیارے ابا جی میں اس ایمان کا اک ذرہ حاصل کروں گا اور اس کی کوشش بھی کروں گا کہ جیسا ایمان صحابہ کرامؓ کا تھا اس کا کوئی کروڑواں حصہ ہی نصیب ہو جائے تو خوش بختی ہوگی۔ آپ نے صحیح فرمایا! اللہ کو عبادت گزار بخیل سے گناہ گار سخی زیادہ پسند ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ مال کی محبت دل میں گھر کر جاتی ہے۔ مگر میں کوشش کروں گا کہ یہ محبت دل سے نکل سکے اور میری قبر میں بھی کچھ روشنی ہو سکے۔ آپ کہا کرتے تھے صلہ رحمی ون وے ٹریفک ہوتی ہے، رشتہ دار برا سلوک کریں تو بھی تمہیں ان سے اچھا سلوک کرنا ہوگا۔ ادھر سے کچھ نہیں آئے گا پس ادھر ہی سے جائے گا۔ حتی الامکان میں اس پر بھی توجہ دوں گا۔ آپ کے اکثر شاگرد آتے رہتے ہیں بڑی عقیدت اور محبت سے آپ کا تذکرہ بھی کرتے ہیں، میں ان سے بھی درخواست کرتا ہوں اور خود بھی

آپ کے لیے استغفار کرتا رہتا ہوں۔ آپ کے لئے دعا گو رہتا ہوں۔ والدین تو سبھی اچھے ہوتے ہیں مگر آپ تو میرے محسن تھے۔ میں اک عام سا طالب علم تھا مگر آپ کی شبانہ روز محنت کی وجہ سے میں ایشیا کے عظیم طبی اداروں سے پیشہ وارانہ تربیت حاصل کر کے نکلا۔ آپ نے نہ صرف حق ادا کیا بلکہ احسان کیا میری زندگی بنا دی۔ آپ کی کس قدر محبت ہے کہ جیسے آپ میری دنیاوی زندگی کے لئے سرگرداں رہے میری کامیابیوں کے لئے کوشاں رہے اسی طرح آپ میری اُخروی زندگی کے لئے بھی فکر مند ہیں، جس کا اظہار آپ نے اس خط میں کیا۔ بڑا بھائی بہن آپ کے پوتے اور نواسے آپ کو بہت یاد کرتے ہیں، آپ کے ہزاروں شاگرد جو ڈاکٹر، انجینئر اور اعلیٰ حکام میں سے ہیں آپ کی عظمت کے گن گاتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں جسے آپ جیسے ابا جی ملے کہ میں نہ صرف اپنے علاقہ میں بلکہ اور بھی کہیں آپ کے جاننے والوں کے پاس گیا تو ہمیشہ آپ کی ہر جگہ سے تعریف ہی سنی۔ میں نے بہت کچھ کہا سنا لکھا پڑھا میری متعدد کتب شائع ہوئیں، کالم بھی چھپتے رہتے ہیں مگر اپنے علاقہ میں اب بھی میرا تعارف آپ ہی کی وجہ سے ہے۔

ابا جی! آپ کو یاد ہے میں جب ایم بی بی ایس فائنل ایئر میں پڑھتا تھا تو آپ کہا کرتے تھے تو سارا دن میڈیسن اور سرجری کی کتابیں پڑھتا رہتا ہے (ہمارا قصبہ دریا کے کنارے ہے) صبح ہم سیر کے لئے جایا کرتے تھے ہمارے گاؤں کے سادہ سے بزرگ (جنہیں ہم بھائی عاشق گدے والا کہتے تھے) ساتھ ہوا کرتے تھے، وہ کہا کرتے تھے۔

''بھلا وہ بھی کوئی انسان ہے جو قصبہ کا سارا بازار پار کر جائے اور اسے کوئی سلام تک نہ کرے''
بھائی عاشق حسین ان پڑھ تھے مگر جاہل نہ تھے۔ آپ کو یاد ہے میں نے اک روز نیا تجربہ کرنا چاہا، بازار سے سبزی اور فروٹ لانے کیلئے میں آپ کے ساتھ ہولیا، میں نے آپ کے کان میں کہا۔

''میں گنتا جاتا ہوں بازار میں دیکھیں کتنے لوگ آپ کو سلام کرتے ہیں؟''

میں نے دیکھا کہ 60 سے زائد اشخاص نے آپ کو سلام کیا، قصبہ کا بازار ہوتا ہی کتنا ہے!

آپ نے مجھے بتایا کہ اگر ہم ضد اور انا چھوڑ دیں، اپنی خامیوں سے بددل نہ ہوں اور ان کی اصلاح کرتے رہیں، اپنی غلطیاں قبول کریں اور کسی کے سر نہ تھوپیں تو پھر ہمارا من مضبوط ہوتا جائے گا پھر ہم دلوں پر حکومت کر سکیں گے۔ اگر ہم دوسروں کی خامیوں پر انہیں لعنت ملامت نہ کریں تو یہ ہماری اپنی راحت کا سبب ہوگا، پھر دنیا کے نشیب و فراز ہم پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔

بہت جلد ہمیں بھی تو آپ ہی سے آملنا ہے۔ رب کریم آپ سے راضی ہو اور آپ کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنائے۔ (آمین)

والسلام

آپ کا بیٹا.....سلیمان عبداللہ (بلکہ سلیمانی)

نوٹ: 2 سال قبل یہ تحریر لکھی، آج دوبارہ پڑھی تو سلیمانی کا لفظ پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں۔

بھیگ جاتی ہیں اس امید پہ آنکھیں ہر رات
شاید اس وقت وہ مہتاب لب جو آئے

بہت روئے مگر ابا جی کو واپس نہ لا سکے۔ بالکل اسی طرح ہمارے گھر میں میرے بھی کچھ ''سلیمانی'' ہیں، میں سوچتا ہوں جب یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا تو میرے بچے بھی دارالجزاء میں میرے ساتھ کوئی خط و کتاب کریں گے یا نہیں؟

فروغِ ادب کے لیے وقف
بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
بک ڈائجسٹ لاہور
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ
براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری و نثر) کمپوز کروا کے ''ان پیج'' میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com
آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔
برائے خط و کتابت/ ترسیل زر / رابطہ
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794 - 042-37322996

ڈپٹی کمشنر کی ڈائری

رئیس عباس زیدی/لاہور

گیارہ اگست کی رات کو سیکرٹری سروسز نے اطلاع دی کہ کل شام ۴ بجے رحیم یار خان پہنچ کر فون کرو۔

مبلغ سات سو روپے کا ون وے ٹکٹ ملا۔ ایئرپورٹ پر رضوان احمد اسسٹنٹ کمشنر نے استقبال کیا۔ پہلا کھانا بریگیڈیئر امجد صاحب نے لیور برادرز کالونی میں اپنی رہائش گاہ پر دیا۔ جو 60 بریگیڈ کمان کر رہے تھے۔

باورچی خانے میں بھی کتابوں کے ڈھیر۔ یاد رہے کہ یہ بریگیڈیئر صاحب بعد میں میجر جنرل پنو عاقل اور پھر لیفٹیننٹ جنرل ہو کر کور کمانڈر ملتان، چیئرمین نیب اور چیئرمین فوجی فاؤنڈیشن ہوئے۔

الیکشن کا آغاز ہو گیا۔ اُمیدواروں کی لسٹیں فائنل ہو گئیں تو اُمیدواروں جن میں مخدوم الطاف صاحب مرحوم، مخدوم شہاب الدین صاحب، مخدوم احمد محمود صاحب، رفیق لغاری صاحب جیسے لوگ شامل تھے۔ اُن سے ایک میٹنگ کی، جان بوجھ کر SSP ملک اعجاز مرحوم اور کرنل کاظمی کو ساتھ بٹھایا۔

''سپورٹس مین ہوں ایک اچھا ایمپائر اور پورا تولتا ہوں۔ دھاندلی برداشت نہیں کروں گا۔ Fair Play''

الیکشن ابھی دور تھا کہ ٹڈی دل کا حملہ ہو گیا۔ پتہ چلا کہ ٹڈی دل ہندوستان کے ہماچل پردیش، اُتر پردیش اور راجستھان میں کپاس کی پوری فصل کھا گیا ہے۔ ہم لوگ ایک جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حکومت پاکستان کے پلانٹ پروٹیکشن ڈیپارٹمنٹ نے دو سپرے کرنے والے جہاز اور کینٹ ڈویژن نے ایک ہیلی کاپٹر Disposal پر دے دیا۔ ایئرفورس کا ریڈار ہمیں بتاتا کہ مثلاً ۲۸ مربع کلومیٹر بڑا ''دَل'' ہندوستان سے داخل ہو گیا ہے اور ہم سپرے والے جہاز روانہ کر دیتے۔

جس دن فیملی شالیمار ٹرین سے رحیم یار خان آ رہی تھی اُس دن جہاز پر میٹنگ اٹینڈ کرنے بہاولپور گیا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک کرسی فضا میں اُڑی جا رہی ہو۔ واپسی پر کو پائلٹ کی سیٹ پر ہیڈ فون لگا کر بیٹھ گیا۔ اُوپر سے دہلی جاتے ہوئے سنگاپور ایئر لائنز کے پائلٹ سے گپ شپ لگائی۔

ہم نے ٹڈی دل کے حملے سے اپنے ضلع کی کاٹن کی فصل کا ایک ایک پتہ بچا لیا۔ اے کے لودھی صاحب نے تعریفی خط لکھا۔ اس حملے کا فائدہ یہ ہوا پورا ''صحرا'' دیکھ لیا قلعہ دراوڑ سے اسلام گڑھ فورٹ تک۔ ہر ایک بھٹ، ہر ایک ڈاہر ہر ایک ٹوبہ۔ ریت کے ٹیلوں کو بھٹ کہتے ہیں۔ ٹیلوں کے درمیان ہموار اور سخت زمین جس پر چاہو تو جہاز اُتار لو اور ڈاہر کے آخر میں ڈھلوان میں کبھی کبھی ایک ٹوبہ ہوتا ہے جہاں بارش کا پانی اکٹھا ہو جاتا ہے۔ چولستانی باشندے، اُن کے مویشی اور وائلڈ لائف سب وہیں سے پانی پیتے ہیں۔ چولستانی باشندے ہندوستان کے قدیم ترین باشندے ''بھیل'' ہیں۔ ہندو مذہب ہے لیکن یہ اپنے مذہب کے بارے میں کم ہی جانتے ہیں۔ ہولی اور دیوالی مناتے ہیں۔ اُن کا ایم پی اے لالہ مہر لعل بھیل تھا۔ یہ لوگ مجھے ہولی اور دیوالی پر بلاتے اور میں اُنہیں بھگوت گیتا اور رامائن سناتا۔ صحرا کے بے رنگ پس منظر میں ان کی آبنوسی جسموں والی عورتیں ''گوڑھو گلابی'' کپڑے پہنتی ہیں۔ کہنیوں سے اُوپر تک سفید چوڑیاں گلے میں چاندی کا کنٹھا۔ مرد جفاکش، محنت کش، بھیڑ بکریاں اور گائیں ہانکتا ہوا۔

اسی طرح رحیم یار خاں ضلع کا ''ماچھکا'' تھانہ صوبہ سندھ میں ایک جزیرہ ہے یعنی ماچھکا جانے کے لیے ہمیں صوبہ سندھ سے گزرنا پڑتا ہے۔ زبان سندھی، آبادی زیادہ تر ہندو، کلچر ہندو اور سندھی۔ چھ پٹوار سرکل، چھ یونین کونسلیں، تین دریائے سندھ کے اس طرف اور تین دوسری طرف۔ صوبہ سندھ میں صوبہ پنجاب کے اس جزیرے کے دریائے سندھ پار جانے کے لیے کشتی یا پھر ڈیڑھ سو میل کا سفر کرنا پڑتا۔ جب کبھی ہم بین الصوبائی میٹنگز میں اس علاقے کو سندھ کے حوالے کرنے کی بات کرتے یہ لوگ اخباروں میں خبر شائع کرواتے:

''پنجاب کی نااہل انتظامیہ ہمیں سندھ کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔''

پہلی بار جب ماچھکا گیا تو دیکھا کہ وہاں دو آباد مندر ہیں، وہاں بھجن گائے جا رہے ہیں ''پرساد'' تقسیم ہو رہا ہے۔ سر پر رومال ڈال کر ادب سے بیٹھا کہ مجھے ''گیتا'' کا پاٹھ سناؤ۔ مگر پجاری جی بھاری بھرکم گرنتھ صاحب اُٹھا لائے اور گروبانیاں سنانا شروع کر دیں۔

''بھائی! یہ ہندوؤں کی مقدس کتاب گیتا تو نہیں یہ تو سکھوں کی گرنتھ صاحب ہے اور آپ لوگ اپنے کو ہندو کہتے ہیں''

''سائیں! ہمارے بڑے یہی کتاب پڑھتے آئے ہیں۔ ہم یہی پڑھتے رہیں گے۔'' چاچڑاں شریف میں خواجہ غلام فرید کا گھر، حجرہ اور مسجد ہے۔

وچ روہی دے رہندیاں
نازک نازو جٹیاں
راتیں کرن شکار دلیندے
ڈیہاں ولوڑن وٹیاں
کر کر دردمنداں کوں زخمی
ہے ہے بدھن نہ پٹیاں

دھویں دھار فقیر تھیو سے
فخر وڈایاں سٹیاں
مونجھ فرید مزید ہمیشہ
اَج کل نشیاں گھٹیاں

خواجہ صاحب کے ہاں ملاں کے خدا کے برعکس صوفی کا خدا محبت اور پرستش کیے جانے کے لائق ہے۔ مصدقہ حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتے ہیں خواجہ غلام فرید تو محبوبِ حقیقی کو حضرت موسیٰ علیہ کے گڈریے کی طرح معصومیت کے ساتھ مدعو کرتے ہیں۔

''پیلوں پکیاں نی آ چنوں رَل یار''

چودھویں رات کی چاندنی میں صحرائی ریت میں سلیکون کے ذرات چمکتے ہیں اور یقین کیجیے آپ اخبار کی سُرخیاں آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ سکون، پاکیزگی، صفائی صحرا میں ٹیلے پر گھنٹوں بیٹھے رہیے کپڑے جھاڑ کر اُٹھ جایئے کپڑے میلے نہیں ہوں گے۔ جنگلی ہرن کسی ٹیلے پر سے کنوتیاں اُٹھائے چوکنے ہوکر دیکھیں گے پھر آپ کا راستہ ضرور کاٹیں گے۔ رات کو جیپ کی ہیڈ لائٹس پڑنے پر اپنی معصوم غزالی آنکھوں سے رُک کر روشنی کی جانب تکنے لگتے ہیں۔ حالانکہ میر نے تو کہا تھا:

ہم سے دُور بہت بھاگو ہو سیکھے طور غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

ایک دن رات کو اچانک حکم حاکم پہنچا کہ ڈسٹرکٹ کونسل کے ایڈمنسٹریٹر کا چارج بھی سنبھال لو۔ اقبال ربانی صاحب مرحوم اُس وقت ڈائریکٹر ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن بہاولپور تھے۔ گھر پر موجود تھے۔ ہم دونوں چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل کے دفتر گئے۔ Incembancy board دیکھ کر ربانی صاحب مرحوم فرطِ جذبات سے رونے لگے۔

''اتنے بڑے بڑے ناموں کے ساتھ تمہارا بھی لکھا جائے گا۔''

یہ چارج بھی تین سال سے زیادہ رہا۔

الیکشن ہوگئے مخدوم الطاف احمد ہاشمی مرحوم سینئر منسٹر پنجاب اور مخدوم شہاب الدین ہاشمی صاحب فیڈرل منسٹر فنانس ہوگئے۔

محترمہ بےنظیر بھٹو کو وزیراعظم بنے پندرہ بیس دن ہوئے ہوں گے۔ پروگرام آیا کہ ایئرپورٹ پر وہ جہاز سے ڈھرکی جانے کے لیے ہیلی کاپٹر پر شفٹ ہوں گی۔ لوگوں نے بہت ڈرایا۔ ہم نے ایئرپورٹ کو کارڈن کر کے ایک چھوٹا سا خوبصورت پنڈال بنایا۔ پرل کانٹینٹل کراچی سے کیٹرنگ کروائی۔ محترمہ کا طیارہ رُکا۔ سیڑھیوں سے اُتریں ماتھے پر تیوریاں۔ تعارف کروایا۔ نام سن کر کچھ لکیریں کم ہوئیں۔

''کب سے یہاں ڈپٹی کمشنر ہو؟''

جواب دیا ''میڈم میں تو Free, Fair impartial الیکشن کروانے آیا تھا۔''

اور وہ مسکرانے لگیں۔ ''شہاب کہاں ہے؟''

''میڈم وہ لاہور میں ہیں۔''

ہیلی کاپٹر کی طرف مڑنے لگیں ''میڈم یہاں کوئی سیاسی شخصیت نہیں ہے۔ پولیس اور ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کے لوگ ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ ایک کپ کافی پی لیں گی تو ہم تاحیات یاد رکھیں گے۔''

''مگر یہ پروگرام میں شامل نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ سے Request ہے میڈم''

اور وہ مان گئیں۔ کافی کے دوران بالکل Relax ہو کر ہم لوگوں سے گپ لگاتی رہیں اور پھر ہیلی کاپٹر میں سوار ہوگئیں۔

دسمبر ۹۳ء قریب آ رہا تھا۔ چودھری منیر صاحب اور پیلس منیجر خورشید صاحب نے بتایا کہ شیخ زید بن سلطان النہیان تشریف لا رہے ہیں۔ استقبال کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ گورنر صاحب اور وزیراعلیٰ بمع چھ فیڈرل منسٹرز استقبال کے لیے پہنچے۔ معلوم ہوا کہ سفیر UAE کے ساتھ طیارہ میں جا کر اُنہیں خوش آمدید کہنا ہے اور رحیم یار خان کی سرزمین پر اُترنے کی دعوت دینی ہے۔ اندر سے گولڈ پلیٹڈ خوبصورت شاہی طیارہ میں پہنچنے تک آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ سفیر نے باقاعدہ تعارف کروایا۔

''رئیس اُل ابوظہبی...... رئیس اُل رحیم یار خان''

ہاتھ ملایا۔ شیخ زید کی عقابی نظروں میں جھانکا اور اُنہیں نیچے اترنے کی دعوت دی۔

خدا کا شکر کیا کہ مشرقی پنجاب کے ایک مہاجر باپ نے اپنے آخری بچے کا نام ''رئیس'' رکھ دیا تھا اور خدا تعالیٰ نے لاج رکھ لی۔

ایئرپورٹ پر چھ چھ ایئربسیں ایک وقت میں اُتریں۔ جنگل میں منگل۔ ایک ایئربس شہزادہ محمد بن زید خود اُڑا کر لائے جو اُس وقت ایئر چیف تھے۔ اب ابوظہبی کے ولی عہد اور وزیر دفاع ہیں۔ خوش شکل، طویل القامت، ہینڈسم اور ہنس مکھ نوجوان۔ موجودہ سربراہ خلیفہ بن زید ایک سنجیدہ اور متانت والی شخصیت کے مالک تھے۔ ایک ایئر ایمبولینس بھی آ کر کھڑی ہو گئی جس میں اوپن ہارٹ سرجری بھی ہو سکتی تھی۔ بین الاقوامی شہرت کے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ۔

اگلی صبح محترمہ بےنظیر صاحبہ ملنے تشریف لائیں۔ مجھے اور ایس ایس پی ملک اعجاز مرحوم کو شیخ زید کے ڈرائنگ روم کی آخری کرسیوں پر جگہ ملی۔ ننھے منے بلاول اور بختاور ہمارے سامنے قالین پر قلابازیاں لگا رہے تھے۔

میں نے بلاول کو بلایا ''ہاتھ ملاؤ''

اور اُس خوبصورت بچے نے معصومیت سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' ملک اعجاز نے پوچھا۔

''ملک کے ہونے والے وزیراعظم سے ہاتھ ملا رہا ہوں'' میں نے جواب دیا۔

''لے وزیراعظم وی انھیں ای بننا اے؟''

''اور کیا میرے اور تمہارے بیٹے بنیں گے۔ میرے اور تمہارے بچے زیادہ تیر ماریں گے تو بس میری اور تمہاری جگہ بیٹھے ہوں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

شیخ زید بن سلطان النہیان محترمہ بے نظیر بھٹو کو بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ ابوظہبی پیلس میں اُن کے بیڈروم میں ایک بیڈ کور تھا جسے ہٹانے کی اجازت نہیں تھی کہ یہ بیڈ کور اُن کے مرحوم دوست ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں تحفہ دیا تھا۔

مجھے ایک ایسی میٹنگ میں بھی بیٹھنے کا موقع ملا جس میں شیخ زید محترمہ بے نظیر صاحبہ اور راقم الحروف فقط چار لوگ موجود تھے۔ محترمہ نے انہیں بتایا کہ اُن پر دباؤ ہے کہ وہ کشمیر پر حملہ کردیں۔ شیخ زید نے عربی میں جواب دیا اور جسے مترجم نے ترجمہ کیا۔

"Tread carefully" احتیاط سے قدم اُٹھاؤ۔

پھر اُنہوں نے بتایا کہ ''مجھے بھی عراق ایران جنگ کے دوران صدر حسنی مبارک نے کہا تھا کہ دونوں ملک جنگ میں مصروف ہیں۔ خلیج فارس میں متنازعہ جزیروں پر قبضہ کرلو۔ میں نے حسنی مبارک سے پوچھا وہ روزانہ مجھے کتنے فائٹر بمبار طیارے اور ٹینک فراہم کرے گا؟''

''کیا مطلب'' حسنی مبارک نے کہا۔

میں نے کہا ''اگر تم مجھے طیارے اور ٹینک فراہم نہیں کرسکتے تو ایسے مشورے کیوں دیتے ہو؟''

میاں منظور وٹو شیخ زید سے ملنا چاہتے تھے۔ پیلس کا موقف تھا کہ جب ملک کا سربراہ مل کر چلا گیا ہے تو اتنا ہی کافی ہے اور پھر شیخ زید محل سے صحرا میں شکار کے کیمپ میں جاچکے تھے۔ میاں نواز شریف چیکے سے آئے اور مل کر چلے گئے۔ ابھی تین ماہ رحیم یار خاں آئے ہوئے تھے کہ پتا چلا طارق مزاری صاحب وہاں آ رہے ہیں۔ کمشنر کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ ''وہ سابقہ وزیراعظم کا بیٹا ہے اُس سے ہمارا کیا مقابلہ''

متحدہ عرب امارات سے VVIP'S کی آمدو رفت رہتی تھی شب و روز۔ ایک دن شام کو خلفان بن سعید مزروئی کا فون آیا، بہت سے کام ذمے لگا رہے تھے۔

میں نے کہا ''میرا تبادلہ ہوگیا ہے۔ اب آنے والے ڈپٹی کمشنر سے کام کہنا''

پھر فون آیا کہ ''مجلس'' ہو رہی ہے یعنی کینٹ میٹنگ اور شیخ زید یاد فرما رہے ہیں۔ جب ابوظہبی پیلس پہنچا تو مجلس ختم ہوچکی تھی۔ خلفان بن سعید اور شیخ زید کے وزیر برائے ذاتی معاملات خمیس ریمتی نے بتایا کہ شیخ زید نے کہا ہے کہ وزیراعظم پاکستان سے کہا جائے کہ اس لڑکے کو Look after کرو ورنہ ہم خود اس کی دیکھ بھال کرلیں گے۔ ساتھ ہی مژدہ سنایا کہ صبح تمہیں C-130 کے ذریعے خاندان اور سامان سمیت ابوظہبی بھیج رہے ہیں۔

میں نے کہا ''پہلے درخواست تو کرو۔ رہی ابوظہبی جانے کی بات تو میں نے ابھی اس سروس میں بہت سے خواب پورے کرنے ہیں۔''

سفیر ابوظہبی برائے پاکستان نے کہا ''ہم بچے نہیں ہیں۔ منظور وٹو وزیراعلیٰ پنجاب نے تمہارا تبادلہ کیا ہے کہ انہیں شیخ زید سے ملنے کا وقت نہیں دے رہے۔ کل رات اُنہیں کھانے پر بلوالو۔''

میاں منظور احمد وٹو صاحب تشریف لے آئے۔ محکمہ انہار کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا۔ نہایت ذہین، تیز طرار، معاملہ فہم، دوسرے کی بات سننے کا حوصلہ اور وقت۔ سپاٹ چہرہ جس سے عام آدمی خوشی یا ناراضگی کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ پاکستان میں سفیر ابوظہبی ریسٹ ہاؤس آئے۔

''یور ایکسی لینسی! ڈپٹی کمشنر کا تبادلہ روکنے کی یقین دہانی کرائیں ورنہ یہ Isssue مذاکرات میں آ جائے گا اور یہ بدمزگی سمجھی جائے گی۔''

ابوظہبی پیلس میں مذاکرات شروع ہوئے وقت چند منٹوں سے چند گھنٹوں تک پہنچ گیا۔

شیخ زاید نے کہا ''یا مجھے ذوالفقار علی بھٹو نے اتنا متاثر کیا تھا یا آپ نے۔''

میاں منظور وٹو صاحب نے اعلیٰ نسل کی گائیں، ایک نہایت قیمتی گھوڑا اور شہزادے عیسیٰ بن زید کے لیے ایک شیر کا بچہ تحفہ میں دیا اور جواب میں ایک قیمتی مرسڈیز کار تحفہ میں پائی جس کے افسانے بہت سی کتابوں میں شائع ہوچکے ہیں۔

دسمبر کی کُہر آلود رات، وزیراعلیٰ صاحب کے طیارے کے عملے نے Take off اور لاہور میں لینڈنگ سے معذرت کرلی۔ وٹو صاحب نے اپنے کمرے میں بلوایا۔

''تمہارے اتنے تعلقات ہیں۔ انہیں کہو اپنے شاہی طیارے میں ہمیں لاہور چھوڑ کر آئیں۔''

ابوظہبی پیلس بات کی تو خلفان بن سعید نے جواب دیا ''آپ لاہور کی بات کرتے ہیں ہم ایک طیارہ آپ کے چیف منسٹر کو تحفتاً دینے کے لیے تیار ہیں۔'' اور یوں شیخ زید کا ذاتی طیارہ اُن کے ذاتی فضائی عملے کے ساتھ میاں منظور وٹو صاحب کو لاہور چھوڑ کر آیا۔

ایک بار شیخ زید بن النہیان کو رُخصت کرنے لاہور سے گورنر صاحب اور اسلام آباد سے آصف علی زرداری صاحب، ڈاکٹر شیر افگن اور جنرل نصیراللہ بابر وزیراعظم صاحب کے فالکن طیارے میں تشریف لائے۔ ہم نے رحیم یار خاں ایئرپورٹ پر ایک چھوٹا سا VIP لاؤنج بنا رکھا تھا۔ تھوڑے سے لوگ تھے جیسے ہی یہ لوگ بیٹھے ڈاکٹر شیر افگن نیازی صاحب نے پاس بلایا اور اپنی میانوالی کی سرائیکی زبان میں بولے:

''اوئے ڈی سی صاحب! یہ آصف سگریٹ نال میڈا چولا ساڑ ڈتا اے۔ میکوں اک چولا تاں گھنا ڈیو''

موصوف نے کریم کلر کا ہائی سوفی کا ایک شلوار قمیض سوٹ پہن رکھا تھا۔ سگریٹ کا گل گرنے سے چار پانچ انچ قطر کا سوراخ ہوگیا تھا۔

تین چار نائب تحصیلدار لڑکے کے بازار دوڑائے، چھٹی کا دن تھا پھر بھی وہ شوخ گلابی رنگ کا ایک شلوار قمیض سوٹ کہیں سے لے آئے۔ ڈاکٹر شیر افگن نیازی بہت خوش ہوئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے کریم کلر کی شلوار پر وہ پنک کلر کا قمیض پہن لیا۔ شیخ زید کا کنوائے جب محل سے چلا تو ہم نے سب کو لائن اَپ کرایا۔ حسب مراتب ڈاکٹر نیازی صاحب نے اُسی ہیئت کذائی کے ساتھ بڑے اعتماد سے اس پوری تقریب میں حصہ لیا۔

شیخ زید پبلک سکول ایک خوشگوار سی ذمہ داری تھی۔ یہاں تقریباً ساڑھے سات سو بچے پڑھتے پیرو مرشد سیّد شوکت علی شاہ صاحب نے ''شوکت بلاک'' بنوایا تھا۔ میں نے ''زیدی آڈیٹوریم'' اور ''زیدی بلاک'' اور ہوسٹل کا اضافہ کیا۔ چک ۲۱۴ کا ایک کچے کوٹھے کا پرائمری سکول جس کے اردگرد ماسٹر صاحب نے ہمیں شیشم کے دو دو درخت لگانے کو کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا جس کا درخت سوکھ گیا اُس کو دو ڈنڈے ہر صبح لگا کریں گے۔

ڈی ایف او سے کہہ کر ساڑھے سات سو درخت منگوائے اور ہر بچے سے کہا کہ ایک درخت لگائے اور اُس کے سامنے اپنے نام کی تختی لگائے اور اُس درخت کو پانی دے اور اُسے سوکھنے سے بچائے اور یوں ایک ہی دن میں چار دیواری کے ساتھ ساڑھے سات سو درخت لگے۔

رحیم یار خان کے گرلز کالج میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز تھیں۔ اڑھائی ہزار طالبات اور فقط پانچ کلاس روم۔ شہر کے دوسرے کونے میں لڑکوں کا کمپری ہنسو ہائی سکول تھا فقط تین سو طلباء اور سو کمرے ان کمروں میں مختلف محکموں نے دفتر سجا رکھے تھے اور تو اور ایک جانباز فورس کی کمپنی اور ایک میجر صاحب بھی براجمان تھے۔ صوبائی محکمہ تعلیم سے بغیر پوچھے بلڈنگز بدلنے کے احکامات دے دیے۔ سامان بیل گاڑیوں پر اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بہادر کا حکم سب مان گئے کہ شہر کی بیٹیاں سب کی سانجھی ہیں اُن کی بھلائی کے لیے یہ کام ہو رہا ہے۔ اتوار والے چھٹی کے دن صبح سویرے سکھر سے ایک ہنس مکھ سے باوردی بریگیڈیئر صاحب گھر تشریف لے آئے۔ چائے کے اُوپر سارا معاملہ سنا اور سمجھا۔

''ویل ڈن! میں آج ہی اپنی جانباز کمپنی کو کہتا ہوں کہ بلڈنگ خالی کریں۔''

سنا ہے اُس وقت کے سیکرٹری محکمہ تعلیم پنجاب نے ڈپٹی کمشنر کی اُس جسارت کے بارے میں سنا تو فقط مسکرا دیے۔

کمپری ہنسو ہائی سکول پچاس ایکڑ پر قائم تھا۔ اُس میں چار رہائشی بنگلے بھی تھے۔ اُن کو ہم نے پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کے مختلف ڈیپارٹمنٹس میں تبدیل کر دیا۔ اہل شہر، پرنسپل بیگم رشید چودھری اور طالبات سب خوش تھے۔ بچیوں نے ایک بہت بڑا کارڈ قد آدم بنایا اُس پر ہزاروں طالبات نے Thank you لکھ کر دستخط کیے اور تیس چالیس طالبات یہ قد آدم کارڈ لے کر دفتر آئیں۔ پرنسپل صاحبہ اور سٹاف ساتھ تھا۔ تشکر کے اس انوکھے انداز سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کالج کی طالبات کے ہزاروں دستخطوں والا کارڈ اب تک محفوظ رکھا ہے اور سرمایۂ حیات ہے۔ اسی طرح خان پور میں پاکستان ریلوے کی بنجر اور بے کار زمین پر قبضہ کر کے وہاں سنٹرل پبلک سکول خان پور کی بنیاد رکھی۔ شہر کے مخیّر حضرات نے بڑا حوصلہ دکھایا۔ اسسٹنٹ کمشنر خان پور جمال مصطفیٰ سیّد نے اپنے خصوصی فنڈ سے ایک بڑی رقم دی اور ایک بڑے خوبصورت ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ اب بھی بطور ممبر سلیکشن بورڈ یونیورسٹی آف لاہور کوئی ڈاکٹر یا انجینئر بتاتا ہے کہ اُس نے میٹرک سنٹرل پبلک سکول خان پور سے کیا ہے تو دل جھوم اُٹھتا ہے۔

تین سال میں ڈسٹرکٹ کونسل کی ۷۰۰ سکیمیں مکمل ہوئیں۔ ڈسپنسریاں، سڑکیں، پل اور سکول اتفاق سے چار میں سے تین اسسٹنٹ کمشنر سول انجینئرنگ گریجویٹ تھے۔ اُن سے چیک کرواتا اور پھر Payment کرتا۔ ایک زمانہ آیا جب ''نیب'' نے تمام ضلعی کونسلوں کا ریکارڈ منگوالیا۔ ایک بریگیڈیئر صاحب نے سبز رنگ کی سیاہی سے لکھے ہوئے اسسٹنٹ کمشنرز کے طویل نوٹ دیکھ کر کہا ''یہ کیا ہے؟''

بتانے پر فرمایا ''اُٹھا کر لے جاؤ یہ سب کچھ''

نواز شریف صاحب کی تحریک نجات چلی۔ انہوں نے بذریعہ ٹرین لاہور سے کراچی جانا تھا۔ اُوپر سے ہدایات ملیں کہ کم لوگ ریلوے اسٹیشن پر جمع ہوں۔ وائرلیس پر ہدایت دی کہ ریلوے اسٹیشن کی عمارت پر ایک مشین گن ماؤنٹ کر دو۔ پولیس لائن افسر نے جب ''کوتھ'' کو کھنگالا تو جنگ عظیم کے زمانے کی ایک پندرہ بیس فٹ لمبی نالی والی پہیے سمیت جسے چرخیوں سے گھمایا جاتا تھا مشین گن نظر آ گئی۔ اُس نے وہی شہر کی طرف رُخ کر کے لگا دی۔ شہری سہم گئے کہ آج نہ جانے انتظامیہ کا کیا پروگرام ہے۔

دوسرے جعفر اقبال صاحب ایم این اے اور میاں امتیاز ایم پی اے بضد کہ دو ہزار آدمی ساتھ لے کر چناب ایکسپریس ٹرین روک کر احتجاج کریں گے۔ بہت سمجھایا کہ ٹرین روکنا انگریز کے قانون میں Mutiny کے مترادف ہے۔ رات کے ڈیڑھ بجے تک مذاکرات ہوتے رہے مگر وہ نہ مانے۔ جاوید اقبال بخاری سٹی مجسٹریٹ نے انہیں 16MPO کے تحت جیل میں بند کر دیا۔ صبح انہیں جیل میں گھر سے ناشتہ بھجوایا۔ TV بھجوایا۔ میاں منظور وٹو صاحب وزیر اعلیٰ کا فون آیا کہ ''پکڑا اپنی مرضی سے ہے چھوڑنا

میری مرضی سے۔''
ٹرین آ کر گزر گئی۔ ریلوے اسٹیشن پر اُس توپ نما مشین گن کے نصب ہونے سے خوفزدہ فقط چند ہزار لوگ ہی اکٹھے ہو سکے۔ چیف سیکرٹری جاوید قریشی صاحب کو اطلاع دے دی۔
دفتر میں بیٹھے ہوئے جنرل نصیر اللہ بابر وزیر داخلہ کا فون آ گیا۔
''اوئے کا! انہیں کیوں پکڑا ہے۔''
جواب دیا تو فرمایا ''اب پکڑ لیا ہے تو تھوڑا رگڑا بھی دو''
''سر! میں کربلا اور شام کے قیدی کی اولاد ہوں رگڑا نہیں دے سکتا۔''
فون پر چند لمحے خموشی رہی۔ توقع تھی کہ معطلی یا چارج چھوڑنے کا مژدہ جانفزا ملے گا لیکن جواب ملا۔
''اچھا یار جیسے تمہاری مرضی''
اس ڈائیلاگ کے بعد جنرل نصیر اللہ بابر صاحب سے باقاعدہ دوستی ہو گئی۔ کوئی پٹھان کراچی یا پشاور سے کسی کام سے چلتا تو اُسے کہتے:
''زیدی ہمارا بھائی ہے اُس کے پاس چلے جاؤ۔''
اس بہادر سپاہی کی دل سے عزت کرنے کو جی چاہتا ہے۔
مخدوم الطاف احمد صاحب اور مخدوم شہاب الدین صاحب سے باقاعدہ نیاز مندی ہو گئی۔ میانوالی قریشیاں کے یہ مخدوم پڑھے لکھے وضع دار اور خاندانی لوگ ہیں۔ مخدوم الطاف صاحب کو ایئرپورٹ سے ریسٹ ہاؤس لے جانے لگتا تو کہتے:
''شاہ صاحب! ہمیں پنواریوں کی چائے پلائیں گے؟ چلیں گھر چلتے ہیں۔''
ڈی سی ہاؤس کے باہر گاڑیوں کا ہجوم بڑھتا جاتا اور وہ بڑے اطمینان سے چائے، سگریٹ کے کش اور گلاب جامن کھاتے رہتے۔

جب میں انہیں بتاتا کہ باہر بہت لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں تو سرائیکی میں کہتے:
''ہر ویلے سیاست کریندے ہن''
میرے دونوں بچوں سے بہت پیار کرتے کہتے ''میں انہیں پڑھنے کے لیے باہر بھیجوں گا۔''
ایسے مخلص صاف ستھرے سیاست دان وطن عزیز کی سیاست میں ناپید ہیں۔ ایک بار اُن کے گھر ہم کھانا کھا چکے تھے۔ مخدوم اعجاز صاحب اُن کے چھوٹے بھائی واش بیسن پر ہاتھ دھو رہے تھے۔ فرمایا ''شاہ صاحب! اگر میرا یہ بھائی بھی آپ کو کوئی غلط کام کہے تو اسے جیل میں ڈال دیں۔''
میں نے کہا ''سر! یہ میرے معصوم دوست اور بھائی ہیں۔ انہوں نے کیا غلط کام کرنا اور کہنا ہے۔''
اپنی بے وقت موت سے دو دن پہلے رحیم یار خان آئے۔
''شاہ صاحب! نائی نے میرے بال بہت چھوٹے کر دیے ہیں۔''
''سر! گھر کی کھیتی ہے پھر آ جائیں گے۔''
یہ فقرہ دن میں کئی دفعہ دہرایا۔ اس قد آور شخصیت کا یہ معصومانہ سا Concern تھا جو مجھ سے Share کر رہے تھے۔ انتقال سے چند گھنٹے پہلے بھی فون آیا:
''پرسوں آ رہا ہوں بہت سے کام کرنے ہیں''
اور کاموں کی لسٹ بتائی۔
پھر پتا چلا کہ خلیفہ سیفی انہیں پی آئی سی لے گئے ہیں۔ جہاں ڈاکٹر شہریار نے ڈکلیئر کر دیا کہ وہ خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ پی آئی اے کا بوئنگ طیارہ ۹۶ ایم این ایز اور ایم پی ایز کے ساتھ اُن کا جسد خاکی لے کر پہنچا۔
نماز جنازہ پر پہنچے۔ میانوالی قریشاں میں ہم نے ایمرجنسی میں ہیلی پیڈ بنایا۔
فاروق لغاری صاحب سے کہا ''بہت دکھ ہوا

سر! آپ کے بہت گہرے دوست رُخصت ہو گئے۔''
"Yes, he was a friend" انہوں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔
مغرب کے وقت ہم نے ''موءِ مبارک'' میں انہیں مٹی دے دی۔ میں آخری وقت تک اُن کے سرہانے کھڑا رہا جبکہ اُن کا بڑا بیٹا اُن کے سینے پر کافی دیر تک لیٹا رہا۔ کوئی ہٹانے لگا تو ایک بوڑھے نے سرائیکی میں کہا ''ارمان پورے کر لینے دو''
ملک کا، پاکستانی سیاست کا اور ہمارا ذاتی ناقابل تلافی نقصان ہو گیا۔
مخدوم اشفاق احمد صاحب اُن کے چھوٹے بھائی کو جذباتی ہو کر الیکشن لڑوایا اور کامیاب کروایا۔ چوہدری منیر کے والد چاچا ہدایت اللہ صاحب ضلع کی ارائیں برادری کے سردار تھے اور تو اور اُن سے بھی ووٹ مانگنے چلا گیا اور ''چاچا'' نے بھی مایوس نہیں کیا۔
ڈپٹی کمشنری کے دن خاصے Eventful ہوتے ہیں۔ ایک شام ایئرپورٹ والوں نے خبر دی کہ ایک روسی Mi-8 ہیلی کاپٹر ازبکستان سے راجستھان جا رہا تھا اُس کا فیول ختم ہو گیا اور لینڈ کر گیا ہے۔ پولیس کو کہا گھیرے میں لے لو۔ وزارتِ داخلہ ISI اور MI کے میجر صاحبان کو اطلاع دے دی۔ جنہوں نے تصویریں اُتاریں اور کیمروں کے نصب نہ ہونے کی تصدیق کر دی۔ مرکزی وزارتِ داخلہ اور CBR نے ڈپٹی کمشنر کو ایک دن کے لیے امیگریشن افسر اور کسٹم آفیسر ڈکلیئر کر دیا۔
فقط آٹھ روسی اُس میں سوار تھے۔ کپتان انگریزی جانتا تھا اور روسی ادب سے شناسا تھا۔ اُس سے ٹالسٹائی، پشکن، دوستوفسکی اور گوگول پر بات چیت شروع ہو گئی۔ سفارتی مذاکرات کے نتیجے میں انہیں رات ٹھہرنے اور فیول دینے کا فیصلہ ہو گیا۔ ریسٹ ہاؤس میں انہیں فقط ایک کتاب اور ٹوتھ برش لے جانے کی اجازت دی۔ ریسٹ ہاؤس پر بھی سخت

پہرہ لگوایا اور اگلے دن انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

یہ ضلع خاصا سکریٹرین تھا۔ محرم میں دو چار فرقہ وارانہ قتل ہو جاتے تھے۔ ملک اسحاق سپاہ صحابہ کے ضلعی صدر اور لشکر جھنگوی کے سالار اعظم تھے۔ جب چارج سنبھالا تو وہ جیل میں تھے۔ چند روز بعد ہی جیل کی انسپکشن رکھی۔ اُن کی بیرک میں سے سب لوگوں کو نکال کر سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہا کہ ''بیرک کو باہر سے بند کردو۔''

''ملک صاحب! میں یہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوں۔ بطور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میرا کوئی مسلک نہیں۔ اگر کوئی مسلک ہے بھی تو جھنگ رکھ آیا ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اُٹھالوں گا۔ سیدھا سادا مسلمان ہوں صبح قران پڑھتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، ویسے میرے کمرے میں قرآن، بائبل، بھگوت گیتا، رامائن اور گرنتھ صاحب کی میری پسندیدہ ''گروبانیاں'' بھی رکھی ہوئی ہیں۔

''میرے واسطے کی کر سکدے او'' اور پھر فرمائشوں اور گلے شکوؤں کی لمبی فہرست جس پر صدق دل سے ہاں کرتا گیا، نوٹ کرتا گیا۔ ایک گھنٹہ کی طویل ملاقات کے بعد جب میں بیرک کا دروازہ کھول کر باہر جارہا تھا تو ملک اسحاق نے کہا:

''او سیّدا! اپنے سپاہیاں توں سوٹیاں وی لے لے تیرے ضلع وچ ہن کُجھ نہیں ہووے گا۔''

اور تین سال سے زیادہ تین محرم اُس ضلع میں فرقہ واریت کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ ملک صاحب سے رابطہ رہتا، کوئی غلط فہمی ہوتی تو باہمی مذاکرات سے دُور ہو جاتی۔

طارق محمود صاحب کے بطور کمشنر بہاولپور ڈویژن آ جانے سے زندگی آسان ہو گئی۔ ناولسٹ افسانہ نگار مرنجاں مرنج شخصیت لیکن موثر افسر۔ دورے پر آتے تو رات ڈھل جاتی لیکن ادبیاتِ عالیہ، شاعری اور فلسفے پر گفتگو ختم ہونے کا نام نہ لیتی لیکن جب افسری پر اُترتے تو مختصر حکم دے کر فور اُفون بند کر دیتے۔

خواجہ غلام فرید اور اُن کی شاعری سے عقیدت ایف ایس سی کے دنوں سے تھی۔ تقریباً آدھا کلام زبانی یاد۔ کمشنر صاحب سے اجازت لے کر چاچڑاں شریف میں خواجہ صاحب کا حجرہ اور اُن کی مسجد محکمہ آثارِ قدیمہ کے ذریعے ڈسٹرکٹ کونسل کے فنڈز سے اپنی اصلی حالت میں واپس مرمت کروایا۔ نیاز مندی کے طور پر ایک چھوٹی سی پلیٹ بھی لگوائی۔ خدا کا شکر کیا کہ اُس نے اس قابل کیا کہ اُس عظیم صوفی شاعر کی خدمت میں اپنا حقیر سا نذرانہ عقیدت پیش کر سکوں۔

میر زاہد حسین صاحب صادق آباد کی معروف شخصیت۔ اُن کے کتب خانے میں بے شمار کتابیں۔ میں نے کوئی ذاتی کتب خانہ اتنا بڑا نہیں دیکھا۔ پرانے اور اصلی مسلم لیگی، محترمہ فاطمہ جناح کے قریبی ساتھی، تحریک پاکستان کے مجاہد، میر صاحب سے فرمائش کرتا تھا کہ مولانا محمد علی جوہر کے ''کامریڈ'' کا اکتوبر ۱۸۸۴ء کا شمارہ چاہیے تو چند منٹوں میں پیش کر دیتے۔ مرنجاں مرنج شخصیت۔ اُن کے فرزند میر فضل حسین فضلی صاحب سے دوستی ہوگئی۔ ہم والد کی طرح اُن کی عزت کرتے اور وہ اُسی طرح شفقت فرماتے۔ وضع داری کا یہ عالم کہ گھر سے باہر گاڑی تک چھوڑنے آتے اور شیخ سعدی کا فارسی کا ایک شعر پڑھتے چلے آتے کہ تم جا رہے ہو مگر سعدی کا دل اور جان ہمراہ لیے جاتے ہو۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

یہ یوپی کی اشرافیہ کے لوگ تھے۔ اپنی تمام تر وضع داریوں کے ساتھ زندہ رہے اور انہیں خوب نبھایا۔ قائداعظم اور مادرِ ملت فاطمہ جناح سے اُن کی عقیدت اور محبت مثالی تھی۔ مادرِ ملت کے قریبی ساتھی اور وہ بھی ہمیشہ جب سفر کرتیں کراچی اور لاہور کے درمیان تو ٹرین سے سفر کرتیں اور لاہور سے کراچی تک فقط میر زاہد صاحب کا بھجوایا ہوا کھانا قبول کرتیں۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں اُن سے سننے کو ملیں۔ بڑی نایاب کتابیں اُن سے لے کر پڑھیں۔ ڈاکٹر دین محمد تاثیر کا دیوان اور اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کا ''دیوانِ مخفی'' اُن سے لے کر فوٹو کاپی کروا کر رکھ لیا۔

ڈیزرٹ میں بارڈر کے ساتھ سفر کرتے ہوئے وائرلیس کبھی ہندوستانی فریکوینسی پکڑ لیتا۔ اسلام گڑھ کے پاس رینجرز کی بی ایس ایف (ہندوستان کی بارڈر سیکورٹی فورس) سے ماہانہ بارڈر میٹنگ ہوتی۔ رینجرز کے افسروں سے فرمائش کی اپنی اس میٹنگ میں اُس پار کے ضلعی افسر کو بھی مدعو کرلیں۔ یہ صوبہ راجستھان کا ضلع سردار گڑھ ہے۔ کلکٹر سردار گڑھ کنور بلبیر سنگھ تشریف لائے۔ یہ (IAS) انڈین ایڈمنسٹریٹر سروس سے تھے۔ مشرقی پنجاب کے ضلع گرداسپور کا ڈومی سائل۔ ایک لمبا تڑنگا ہنس مکھ Typical پنجابی، چائے اور بسکٹوں کے مختصر سے سیشن سے گزر کر ہم دونوں جلد ہی پنجابی لطیفوں پر اُتر آئے۔ ایک زبان، ایک کلچر، ایک سے سرداروں کے لطیفے اور سرحدوں کی خاردار تاریں دُور کھڑی منہ چڑاتی نظر آئیں۔ کلچر بہت ہی طاقتور چیز ہوتی ہے۔

ایک تحریک عدم اعتماد کے نتیجے میں سردار عارف نکئی وزیر اعلیٰ ہو گئے۔ رنجیت سنگھ کے دور کے بارے میں لکھی گئی کتابوں میں نکئی سرداروں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ اُن کے بارے میں لطیفے مشہور ہیں لیکن میں نے سردار عارف نکئی صاحب کو بہت سمجھدار بے جا پروٹوکول سے بے نیاز اور بہت جلد کسی بھی معاملے میں قائل ہو جانے والا شفیق انسان پایا۔

(جاری ہے)

انٹرویو: فاروق طراز

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات فارروق طراز اوران کی منفرد شاعری سے بخوبی واقف ہیں۔ خوبصورت شعر کہنے کے ساتھ ساتھ وہ ان چند خوش بخت تارکینِ وطن میں شامل ہیں جنہوں نے تمام زندگی پاکستانی زبانوں کی دیارِ غیر میں ترویج اور اپنے ادب کو عالمی سطح پر روشناس کروانے کی کوششوں میں صرف کی ہے۔ مقبول شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کامیاب کاروباری شخصیت بھی ہیں۔ میں تو اسے خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ کرونا وائرس کے عالمی پھیلاؤ کے دنوں میں وہ کیلی فورنیا کی بجائے پاکستان میں ہیں۔ اتفاق سے راقم بھی ان دنوں پاک سرزمین کی کشورِ حسین یعنی میاں چنوں میں ہے۔ اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کورنٹینا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فاروق طراز کو ارژنگ کے قارئین کے لیے انٹرویو کی گزارش کی، جو انہوں نے شاید اس لیے مسترد نہیں کی، چونکہ ہم دونوں کی جائے پیدائش ایک ہی گاؤں ایک ہی گلی میں واقع ہوئی ہے۔

ارژنگ: آپ کی پیدائش تو میاں چنوں میں ہوئی، اپنے بچپن اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتایئے؟

فاروق طراز: ابتدائی تعلیم میاں چنوں میں ہی مکمل کی۔ کالج سے گریجوایشن کرنے کے بعد میں امریکہ چلا گیا۔ یہ سن 1980ء کی دہائی تھی جب میں پاکستان سے جا کر امریکہ میں بس گیا۔

ارژنگ: شعر گوئی کی جانب کیسے راغب ہوئے؟

فاروق طراز: ہمارے گھر کے عقب میں اردو اور پنجابی کے معروف شاعر سالک ربانی رہائش پذیر تھے۔ بچپن سے اُن کے ساتھ نیازمندی کا تعلق تھا۔ چونکہ سالک ربانی صاحب کو اردو، پنجابی اور عربی کے علاوہ فارسی زبان پر اُستادانہ مہارت و عبور حاصل تھا، ان کے حلقے میں بوٹا انجم اور صدیق ربانی جیسے سخنور شاعر تھے جس کے سبب ایک ادبی ماحول موجود تھا۔ میں نے شروع شروع میں پیروڈی اور مزاحیہ شاعری کی غیر سنجیدہ سی کوشش کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ تم غزل بھی کہہ کر دیکھو۔ چنانچہ ان کے مشورے پر پہلی مرتبہ میں نے غزل کہی۔

مجھے ٹون اپ سالک ربانی صاحب نے کیا، وہ اکثر کئی طرح مصرع دے دیتے تھے کہ اس پر کوئی غزل کہو، اس طرح سے زمانۂ طالب علمی میں وہ میری شعری تربیت کرتے رہے۔ وہاں سے ہی شاعری پڑھنے کا بھی شوق ہوا اور اسی طرح سے یہ سخنوری کا یہ سارا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ارژنگ: امریکہ کیسے جانا ہوا؟ عمر کا ایک بڑا حصہ وہاں گزرا، کیسا تجربہ رہا؟

فاروق طراز: میں اسے ایڈونچر کا شوق ہی کہوں گا۔ حالانکہ پاکستان میں معاشی آسودگی میسر تھی، مگر دوستوں کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا، ویزہ لگوایا اور امریکہ جا پہنچے۔ وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

ارژنگ: آپ نے تمام زندگی شعر گوئی میں گزاری، مگر ابھی تک آپ کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا، اس کی کیا وجہ ہے؟

فاروق طراز: اس میں میری کوتاہی اور سستی بھی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے وقت بھی نہیں ملا۔ کام کی مصروفیت کچھ اتنی زیادہ تھی اور میں کاروبار کے منحوس چکر کے علاوہ شاید یہ بھی وجہ سمجھتا ہوں کہ شعر و شاعری میں خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔ بہت شعر کہا مگر ہمیشہ یہی سوچا کہ اس سے بہتر شعر کہنا ہے۔ اسی سبب سے مجموعہ کلام کی اشاعت تاخیر کا شکار ہوتی رہی۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب میرا ایک شعری مجموعہ زیرِ طباعت ہے۔ دو مزید اُردو شعری مجموعے مکمل ہیں اور پنجابی کے کئی مکمل اور مطبوعہ مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔

ارژنگ: اپنی ازدواجی زندگی کے حوالے سے کچھ قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

فاروق طراز: امریکہ جانے کے بعد میں نے وہاں شادی کی تھی۔ ازدواجی تجربے کے حوالے سے گفتگو تو ہوسکتی ہے مگر میں کسی اور کی ذاتی زندگی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ اب میں نے پاکستان میں شادی کی ہے۔ الحمدللہ بہت خوشگوار زندگی کا احساس ہو رہا ہے۔ میری ایک بیٹی ہے، غزل فاروق اس کا نام ہے۔

ارژنگ: ادب کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟

فاروق طراز: میرا ادبی نظریہ شروع سے ترقی پسندی، جدیدیت اور ادب برائے زندگی کا رہا ہے۔ ہجر و فراق کی شاعری بھی اچھا موضوع ہے مگر اس پر رک نہیں گیا۔ آپ کو میری شاعری میں اسی لیے ایک آفاقیت محسوس ہوگی۔ میں نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

ارژنگ: آپ کا ڈکشن بڑا خوبصورت ہے۔ کیا کبھی نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے؟

فاروق طراز: نثر میں نے حال ہی میں لکھنا شروع کی ہے۔ کالم نگاری شروع کرنے کا سوچ رہا ہوں۔

حالات حاضرہ پر تبصرے سوشل میڈیا پر لکھتا رہتا ہوں۔

ارژنگ: آپ وسیع المطالعہ ہیں، کن مصنفین نے زیادہ متاثر کیا؟

فاروق طراز: میں کسی ایک مصنف کا نام نہیں لے سکتا۔ بہت سارے لکھنے والوں کی کتابوں اور تحریروں نے متاثر کیا۔ میری خوش قسمتی کہ میں برکلے یونیورسٹی کی آغوش میں پلا بڑھا ہوں۔ یہ 1980ء کی دہائی میں وہ دور تھا جب پاکستان میں ضیاء الحق کا ظالمانہ مارشل لاء نافذ تھا ار ترقی پسند مصنفین یہاں سے ہجرت کر رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے برکلے یونیورسٹی کے کیمپس اور سان فرانسسکو کے گردونواح میں آباد ہوئے۔ یہ دنیا کی ٹاپ ٹین یونیورسٹیوں میں ہے۔ یہ بڑا ترقی پسند کیمپس ہے، ویت نام جنگ کے خلاف احتجاج سے لے کر دیگر سماجی تحریکوں کا یہ گڑھ رہا ہے۔ بہت سے شعراء پاکستان سے ہمارے پاس آتے تھے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی آپ بیتی میں کبھی ان محفلوں کا ذکر تحریر کروں جو برصغیر کے نامور شعراء وادباء کی میزبانی کے دوران ان کے ساتھ میری رہیں۔ احمد فراز اکثر آتے اور ہمیشہ میرے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ فراز صاحب نے مجھے بیٹا بنایا ہوا تھا۔ ہم نے خوب سیر سپاٹے کیے۔ بڑا اچھا وقت گزارا۔ بڑی ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ میرا گھر سان فرانسسکو میں ادب کا گہوارہ رہا ہے جن میں بڑے بڑے ادیب شریک ہوتے رہے۔ ان میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، جاوید اختر، جاوید اختر، شبانہ اعظمی، علی سردار جعفری اور بشیر بدر سے لے کر دلیپ کمار تک ایک طویل سلسلہ ہے۔ ہم نے پاک انڈیا فرینڈشپ سوسائٹی بھی قائم کی جس کا مقصد ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا تھا۔ تاکہ جو پیسہ دونوں ممالک اسلحے کی دوڑ میں خرچ کرتے ہیں اسے لوگوں کی صحت اور تعلیم کی بہتری اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

ارژنگ: سن 1980ء اور 2020ء کے امریکہ میں کیا فرق دیکھتے ہیں؟

فاروق طراز: سن 80 کی دہائی اور آج کے امریکہ میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس میں 11 ستمبر 2001ء کو نیویارک میں رونما ہونے والے حادثے نے سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اسلاموفوبیا بھی اس کے بعد آیا۔ ایک عرب امریکی دانشور نے اسے بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے کہ 9/11 سے پہلے کے امریکہ کی مثال کنواری دوشیزہ جیسی تھی۔ یہ امریکہ معصوم تھا۔ عمومی طور پر امریکی رحم دل اور پیارے لوگ ہیں۔ حکومتی معاملات الگ بات ہیں، مگر جو عوام ہیں وہ خوش آمدید کہنے والے ہیں اور مانتے ہیں کہ تنوع ان کی طاقت ہے۔ ہم تو باہر سے آنے والے لوگوں سے گھبرا جاتے ہیں اور ہمارا رویہ محتاط اور شکوک وشبہات سے بھرپور ہوتا ہے۔ مگر وہاں جو بھی جہاں کہیں سے بھی اُٹھ کر آ جائے وہ خوش ہو کر قبول کر لیتے ہیں۔ اسے سسٹم کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ امریکہ اب بھی ''لینڈ آف آپرچونٹی'' ہی ہے۔ 9/11 کے بعد گرچہ بہت سارے قوانین تبدیل ہوئے ہیں اور اسلاموفوبیا بھی ایک لہر کی صورت میں چلا ہے۔ امریکہ کی خوبصورتی مگر یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں۔ چاہے وہ ویت نام کی جنگ ہو، کالوں کے ساتھ بدسلوکی ہو یا پھر حالیہ سالوں میں جنگی مہمات ہوں، غلطی کا احساس ہونے پر امریکی قوم اور ریاست اپنی غلطی کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

والعصر

عائشہ غازی/میاں چنوں

زمانے والو!
سنو زمانہ گواہ ہے کہ
یہاں کوئی بادشہ نہیں ہے
کہ جس کی شاہی ابد تلک ہو
سوائے اس کے جو نور و ظلمت کی خود بچھا کر بساط
اس پر خود اپنے مہروں سے کھیلتا ہے
کوئی ہے ملکہ وزیر کوئی
کوئی پیادہ فقیر کوئی
اسی کے مہرے اسی کی چالوں پہ چل رہے ہیں
زمانے خود ایک دوسرے کو بدل رہے ہیں
سنو زمانہ گواہ ہے کہ
یہ زندگی زندگی نہیں ہے
دلوں کی دھڑکن ہماری مہلت کو گن رہی ہے
ہماری سانسوں میں زندگی اور موت اک ساتھ چل رہی ہے
زمانے والو!
سراب دنیا تو اپنے ہونے میں خود ہی غم ہے
حجابِ ہستی کو چاک کرنے کا وقت کم ہے
چلو کہ سانسوں کی یہ مشقت
یہ بھاگتی دھڑکنوں کی گنتی
یہ کاروبارِ جہانِ خوش رنگ
سب خسارہ ہے
سب ہماری نظر کا دھوکہ ہے
خواب ہے سب
سوائے اس کے جو اپنی مہلت کو اپنے مالک کے ہاتھ بیچے
خسارے والو!
چلو کہ رستے کھلے ہیں اب تک
فلاح کی منزلوں کی جانب
چلو کہ تاریکیوں میں کوئی
چراغ لے کر بلا رہا ہے
دلوں پہ دستک سے اب بھی کوئی
جگا رہا ہے
زمانے والو!
وہ جس کا وعدہ تھا آ رہا ہے

انٹرویو: خالد یزدانی

ارژنگ: آپ کی پیدائش کب کہاں اور کس خاندان میں ہوئی؟

خالد یزدانی: میری پیدائش ماڈل ٹاؤن لاہور میں 20مارچ 1954ء کو ہوئی، میرے والد سید عبدالرشید یزدانی جالندھری کا شمار برصغیر پاک و ہند کے استاد شعرا میں ہوتا ہے' ان کی ساری زندگی ادب وصحافت میں ہی گزری، قیام پاکستان سے قبل وہ بمبے کی فلمی دنیا سے وابستہ بھی رہے جہاں انہوں نے متعدد فلموں کے لئے گیت اور مکالمے بھی لکھے، ان دنوں اداکار علاوالدین اور طالش بھی ان کے حلقہ احباب میں تھے، جبکہ دہلی میں اس وقت کے معروف ادبی جریدے بیسویں صدی جس کے مالک ومدیر خوشتر گرامی تھے کے ساتھ ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے، قیام پاکستان کے بعد وہ کچھ عرصہ کراچی میں مقیم رہے، صہبا لکھنوی کے ماہ نامہ ''افکار'' سے منسلک رہے، اسی دوران فلم ''بارہ بجے، غریب، اور مسکہ پالش کے گانے لکھے اسی طرح ہدائت کار روپ کے شوری کی فلم ''مس 56'' کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر بھی رہے جن دنوں میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا ہم لانڈھی میں مقیم تھے ایک روز بعد میرا رزلٹ آنا تھا، جب کراچی کو خیر باد کہہ کر والد بسلسلہ روزگار لاہور آ گئے' ان دنوں مغربی پاکستان کی آپریٹو یونین نے پندرہ روزہ نیا راستہ کا اجرا کیا، جس کے چیف ایڈیٹر صادق حسین قریشی اور ایڈیٹر شرقی بن شائق اور اسسٹنٹ ایڈیٹر یزدانی جالندھری تھے۔ اسی دوران وہ روزنامہ ''سیاست' اور ماہنامہ ''محفل'' لاہور سے وابستہ ہوئے جب 22مارچ 1990ء کو ان کا انتقال ہوا 23مارچ کو ان کی میانی صاحب قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کے آخری روز وشب ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' کی مجلس ادارت میں گزرے۔ ان کے دو مجموعے ''توصیف خیر البشر'' نعتیہ اور ''تورات دل' غزلیات ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے تھے۔

ارژنگ: ابتدائی زندگی اور تعلیمی سفر کے بارے میں بتایئے؟

خالد یزدانی: جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں ابھی میرا تیسری جماعت کا رزلٹ آنا تھا کہ ہم کراچی سے لاہور آ گئے اور یہاں ایک بار پھر مجھے ایم سی پرائمری سکول ٹمپل روڈ میں تیسری جماعت ہی میں داخل کروایا گیا' بعد ازاں جماعت چہارم اور پنجم کا ایک سال میں امتحان دے کر چھٹی جماعت میں تنگل امبیا اسلامیہ ہائی سکول پل بازار منٹگمری (ساہی وال) میں داخل ہوا جہاں میرے چچا سید ظفر عرفانی سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہاں دل نہ لگا اور میں واپس والدین کے پاس آ گیا اور چشتیہ ہائی سکول کرشن نگر (اسلام پورہ) لاہور میں داخلہ مل گیا اور یہاں حسن بخت اور عارف عبدالمتین جیسے استادوں کی وجہ سے ادبی ماحول بھی میسر آیا اور اسی زمانے میں بچوں کے لئے نظمیں لکھنے کی ابتدا ہوئی۔ چشتیہ ہائی سکول کے بعد فاضل اردو (آنرز) کا امتحان 1972ء میں پاس کیا اور عملی زندگی کا آغاز سینما فوٹو گرافی کے شعبہ سے کیا، آٹھ نو سال مختلف فلموں اور ایڈورٹائزنگ فلمز (کمرشل) کی فوٹو گرافی کی، لیکن اس دوران نظم ونثر لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بلکہ انجمن عوامی ادب پاکستان کی اسرار اعظمی سے مل کر داغ بیل ڈالی اور علامہ لطیف انور کی برسی پر کارپوریشن ہال لاہور میں ایک عظیم الشان مشاعرہ کا انعقاد بھی کیا، اس انجمن کے تحت تیرہ ایسے شعرا کا انتخاب دیپک کے نام سے شائع کیا جن کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا، یعنی صاحب کتاب نہ تھے' یہ وہ دور تھا جب پیسوں کی اتنی فراوانی نہ تھی اور شعری مجموعہ شائع کرانا کاردارد تھا۔ لہٰذا ہماری اس کوشش کو بے حد پزیرائی ملی ہے یاد ہے کہ طفیل ہوشیار پوری اور علیم ناصری کے ساتھ عارف عبدالمتین نے اس کو مرتب کرنے پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا جو اس کتاب میں شامل تھا مگر دیپک کی اشاعت کے بعد احسان دانش نے جو تعریفی سطور راقم کو لکھ کر دیں، اس نے بھی بڑا حوصلہ بڑھایا' اس دوران روزنامہ مغربی پاکستان روزنامہ وفاق کے بچوں کے صفحات بھی ترتیب دیئے، جب اخبار جنگ کا لاہور سے آغاز ہوا تو اس کے ابتدائی عملہ میں، میں بھی شامل تھا، جہاں تقریباً دس سال ایڈیٹوریل اسسٹنٹ میگزین اسسٹنٹ کے طور پر مختلف ذمہ داریاں نبھاتا رہا' اسی طرح لاہور سے جب روزنامہ پاکستان کا آغاز ہوا تھا اس کا میگزین ایڈیٹر رہا اور پھر روزنامہ خبریں اور صحافت میں بھی کچھ عرصہ یہی ذمہ داریاں ادا کیں، 1993ء سے تا حال روزنامہ نوائے وقت لاہور کے شعبہ میگزین سے وابستہ ہوں۔ اسوقت اس کے ملی ایڈیشن اور اوورسیز ایڈیشن کا انچارج ایڈیٹر اور سنڈے میگزین میں ادبی انٹرویوز کے ساتھ گذشتہ دس سالوں سے کتابوں پر تبصرے کر رہا ہوں۔

ارژنگ: موجودہ صحافت کا معیار کیا ہے؟ آپ موجودہ صحافت کے کردار سے مطمئن ہیں؟

خالد یزدانی: ہمارا صحافتی کردار بھی ذاتی اور اجتماعی کردار کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرے کی اقدار اور معیارات تبدیل ہوتے ہیں ان تبدیلیوں کے زندگی کے مختلف شعبوں پر اثرات کا مرتب ہونا بھی لازمی ہے۔ صحافت ہماری قومی اور سیاسی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آج کل تو اسے حکومت ڈھانچے کا چوتھا ستون قرار دیا جارہا ہے لیکن اس وقت بہت تکلیف دہ صورتحال ہو جاتی ہے جب محض ریٹنگ کے لئے ہمارے اینکر پرسن یا کچھ صحافی سچ کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور محض قیاس آرائیوں اور جھوٹ موٹ کا سہارا لے کر بات کرتے ہیں۔ صحافت کا کردار تو اجتماعی رائے عامہ کو ہموار کرنا اور ملکی اور سیاسی معاملات میں حکومت کی راہنمائی کرنا ہے' لیکن اس کردار کی جھلک صحافت سے اگر مکمل طور پر غائب نہیں ہوئی تو کم ضرور ہوگئی ہے، یہ بات ایک لمحہ فکریہ ہے۔

ارژنگ: بدلتے ہوئے ادبی رویوں سے مطمئن ہیں؟

خالد یزدانی: ادب بھی صحافت کی طرح زندگی کی اقدار اور معیارات سے متاثر ہے۔ لگتا ہے کہ ادیب بھی اپنے مشن سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ادب کے نام پر قاری کو گمراہ کیا جارہا ہے' کتابیں دھڑا دھڑ شائع ہو رہی ہیں کیونکہ آج شاعروں ادیبوں کے پاس روپے کی فروانی ہے۔ ہمارا ادب یقیناً آمادہ زوال ہے' اور اگر کچھ عرصہ اور یہی صورتحال رہی تو لوگوں کا ادب اور ادیب سے بھی اعتماد اٹھ جائے گا۔

ارژنگ: کیا صحافت کو محض ایک پیشہ کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے؟

خالد یزدانی: یقیناً صحافت کو پیشہ کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے' لیکن یہ پیشہ دوسرے کاروبار کی طرح بے ایمانی کی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ صحافت سچ کی اساس پر قائم شعبہ ہے اور اسے ہمیشہ سچ اور سچائی کو ساتھ لے کر چلنا چاہئے۔

ارژنگ: ایک صحافی ہونے کے ناطے موجودہ ملکی حالات بارے آپ کی رائے؟

خالد یزدانی: ملک میں سیاسی' انتظامی اور معاشرتی سطح پر پچھلے چند برسوں سے ایک بحرانی کیفیت ہے' ایوان اقتدار سے لے کر عام آدمی تک کے اعصاب شل ہیں۔ حالات کا الجھاؤ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا' خیال تھا کہ 2018ء کے الیکشن کے ساتھ یہ بحرانی کیفیت ختم ہو جائے گی' لیکن پی ٹی آئی کی حکومت بھی عوام کے اعتماد اور خواہشات پر پورا اترتی نظر نہیں آئی۔ عام آدمی مہنگائی کے شکنجے میں ہے حکومت کو عام آدمی کی زندگی کے لئے بنیادی سہولیات کا اعلان کرنا چاہئے۔

ارژنگ: ہمارے موجودہ اہم مسائل کیا ہیں؟

خالد یزدانی: سب سے اہم مسئلہ عام آدمی کی ضروریات زندگی کا ہے' ٹیکسوں کی بھرمار اور بجلی' پانی' گیس کی قیمتوں میں مسلسل اضافے نے زندگی اجیرن کر دی ہے حکومتوں کے معاملے وہ جانیں، حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں، اگر کسی کو اس ووٹر کی حالت زار کو تبدیلی کا احساس نہیں ہے' جس سے ووٹ لے کر آیا پھر جس کے ووٹ کی طاقت سے وہ ایوان اقتدار تک آیا ہے تو کیا کہا جاسکتا ہے، کل بھی عام آدمی کی خوشحالی سب سے بڑا مسئلہ تھا' آج بھی عام آدمی کی بہتری کے لئے حکومتی رویے اور سوچ کا فقدان اہم معاملہ ہے۔

ارژنگ: صحافت کا سنہرا دور کون سا ہے؟

خالد یزدانی: صحافت کا سنہرا دور ہمارا ابتدائی زمانہ تھا' یعنی 1947ء سے لے کر 1971ء تک کا زمانہ صحافت کا سنہری دور کہلا سکتا ہے۔ پہلے منتخب وزیراعظم اور پہلے جمہوری انتخابات اور پہلی جمہوری حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی صحافت کی اقدار تبدیل ہوتی چلی گئی ہیں، لیکن میں ناامید نہیں ہوں' آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو صحافت کو کاروبار نہیں عبادت خیال کرتے ہیں۔

ارژنگ: باہر کے کن کن ممالک کا سفر کرنے کا موقع ملا اور کس مقصد کے لئے سفر کیا؟

خالد یزدانی: 2005ء میں دبئی میں منعقدہ عالمی مشاعرہ میں امجد اسلام امجد، عزم بہزاد اور فرحت عباس شاہ کے ساتھ شرکت کا موقع ملا، جہاں رائٹرز فورم کے پرویز شیخ اور طاہر منیر طاہر نے اس کے انتظام کیا تھا، بعدازاں اسی سال دو روزہ کشمیر کانفرنس میں بیلجئم کے شہر برسلز گیا جہاں پاکستان سے مشاہد حسین سید اور عطیہ عنایت اللہ کے علاوہ اس وقت کے صدر آزاد کشمیر انور خان حریت کانفرنس کے رہنما میر واعظ عمر فاروق اور کلدیپ نیر (انڈیا) نے بھی شرکت کی تھی اسی طرح چند سال قبل برمنگھم چیمبر آج کامرس اور برطانیہ کی ہوم ہاؤس کی دعوت پر فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے ارکان کے ساتھ ایک ہفتہ لندن اور برمنگھم میں قیام رہا جبکہ 2011ء میں پاکستان ایسوسی ایشن جاپان کے زیراہتمام جشن آزادی کے پروگرام میں مہمان خصوصی شرکت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا، سال 2019ء میں عراق اور عمان کے شہر مسقط بھی جانا ہوا جہاں پاکستان کلب عمان کے چیئرمین میاں محمد منیر اور معروف شاعر ادیب قمر ریاض' مروت احمد نے ایک تقریب میں نشان تحسین اور الفا ایونٹس عمان کے فہد اویس منیر نے ''لوح کمال' پیش کیا ان سب کی پرخلوص اور بے پایاں پذیرائی پر ان کا ممنون ہوں، کہ وہ سب ادب کی سرپرستی میں پیش پیش تندہی سے کام کررہے ہیں۔۔۔

شاعری

دبی دبی سی یہ آشفتگی قیامت ہے
کسی کے ساتھ مری دل لگی قیامت ہے
رہے گی حُسنِ پریشاں کی یہ پریشانی
دلِ حزیں تری آزردگی قیامت ہے
نہیں ہے شکوہ کسی کی بھی سردمہری کا
تری طرف سے یہ بیگانگی قیامت ہے
کہیں کھلی کہیں پردے میں یہ چھپی نفرت
فریب و مکر کی یہ زندگی قیامت ہے
فریفتگی کا وہ انداز اُن پہ ہے اے دل
کہیں وہ بزم میں دیوانگی قیامت ہے
ہے حشر نازکی، فتنہ ہے تازگی اُن کی
فقط یہی نہیں رخشندگی قیامت ہے
کہ دعویٰ اپنا بھی مسعودؔ ہے محبت کا
مگر خدا کی بھی وارفتگی قیامت ہے

خالد مسعود/لاہور

دوستی کر لی ہے پیڑوں، پنچھیوں، پھولوں کے ساتھ
خود کو وابستہ جو رکھنا ہے ترے باغوں کے ساتھ
اے اکیلے پن تری جانب پلٹ آیا ہوں میں
کتنا چل سکتا تھا آخر بے وفا لوگوں کے ساتھ
ایک دن چکھ لیں گے دنیا کی طلب کا ذائقہ
جتنا بھی اُٹھ بیٹھ لیں ہم لوگ، درویشوں کے ساتھ
کوٹھیوں سے متصل ہیں ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے
چھوٹی چھوٹی بستیاں جیسے بڑے شہروں کے ساتھ
بولتے ہیں واہمے تو بولنے دیتا ہوں میں
بحث بنتی ہی نہیں ہے میری ان بچوں کے ساتھ
پہلے جیسا ہے سے، تبدیل ہو کر بھی عبید
پھر اُبھر آئے پرانے دکھ نئی صبحوں کے ساتھ

عبیداللہ نزاکت/حاصل پور

عشق کے اپنے ضابطے ہیں میاں
اپنے بھی اُن سے رابطے ہیں میاں
ہم اکیلے ہی نہیں زمانے میں
ساتھ کتنے ہی قافلے ہیں میاں
چھاؤں لے کر قریب آ جاؤ
ہم کڑی دھوپ میں کھڑے ہیں میاں
سب نے مل کے ہمیں دغا دی ہے
جتنے ہمدرد بھی ملے ہیں میاں
دیکھتے ہی نہیں مری جانب
یہ وفا کے مری صلے ہیں میاں
کیسے منزل نصیب ہوگی ہمیں
پاؤں میں اب بھی آبلے ہیں میاں
لے کے تصویر تیری آنکھوں میں
صورتِ نقشِ پاء پڑے ہیں میاں
اُس سے ترکِ وفا میں کر بیٹھا
یہ مرے اپنے فیصلے ہیں میاں
کیا کسی کا گلہ کریں ہم لوگ
اپنی تقدیر سے لڑے ہیں میاں
یہ ترے شہر کے ہیں دیوانے
بولیاں کتنی بولتے ہیں میاں
سب ہمارے لیے بنے ہوئے ہیں
یہ جو دنیا میں رتجگے ہیں میاں
پھیل جاتی ہے روشنی ہر سمت
جب وہ آنکھوں کو کھولتے ہیں میاں
گفتگو جن سے ہو نہیں پاتی
میرے دل کو ٹٹولتے ہیں میاں
میں کسی کا بگاڑتا کیا ہوں
میرے ہمراہ آئینے ہیں میاں
کیا پیامؔ اُن کو دوں نگاہوں سے
میری جانب وہ دیکھتے ہیں میاں

محمد اقبال پیام/لاہور

جدھر دیکھو ستم کی انتہا ہے
مرا کشمیر کب سے جل رہا ہے
ملے گی اُس کو آزادی یقیناً
یہ ہر دیوار پر لکھا ہوا ہے
اکیلے ہیں مگر تنہا نہیں ہیں
کوئی ان کا نہیں لیکن خدا ہے
چھپے گا قتل مظلوموں کا کیسے
خموشی میں لہو تو بولتا ہے
وہی جیتے ہیں جن کا حوصلہ ہے
وہاں جینا تو ہر لحہ سزا ہے

آصف نیاز/لاہور

کورونا،خطرناک ترین وبا

لبنیٰ صفدر/ لاہور

اس وقت دنیا میں موجود ضعیف ترین شخص بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کرونا وائرس جیسی وبا اس نے اپنی زندگی میں دیکھی نہ سنی۔ حیران کن طور پر وائرس اچانک سے نمودار ہوا اور آناً فاناً اس عفریت نے ساری دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ گھات لگائے ہوئے یہ دشمن اچانک دبے پاؤں ہماری زندگیوں میں داخل ہوا اور ہمارے گھروں کی دہلیزوں، کمرے کے دروازوں، کھانے کی میز اور حتیٰ کہ ہمارے ہاتھوں اور پھر ہاتھوں سے چہرے اور سانس کے ذریعے ہمارے اندر ہی پہنچ گیا۔ یہ سانس کو رواں رکھنے والے اعضاء کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، نہ ابھی تک دنیا کا کوئی ملک اس وبا کی حقیقت کو جان سکا ہے اور نہ ہی کوئی حتمی علاج موجود ہے۔ ایک مریض سے دو، دو سے چار اور یونہی ضربیں کھاتی تعداد خطرناک سطح تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا واحد حل Lock Down کی صورت میں تلاش کیا گیا۔ زندہ رہنے کے لیے تنہائی اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی گھروں میں قید رہ کر معاشی صورتِ حال خطرناک ہے۔ عجیب وبا ہے عجیب حالات ہیں۔ گھروں میں رہ کر لوگوں کا فاقے سے مرنے کا امکان ہے اور باہر نکل کر اس بیماری سے مرنے کا خدشہ موجود ہے۔ کرونا وائرس کے پھیلاؤ کے بعد دنیا بھر کے لاکھوں افراد اپنی زندگی بسر کرنے کے انداز کو ڈرامائی انداز میں بدل رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ زندگی نے اپنے انداز غیر محسوس طریقے سے خود بخود بدلنے شروع کر دیے ہیں۔ ان میں سے بہت ساری تبدیلیاں عارضی ہوں گی لیکن بہت ساری تبدیلیاں دائمی بھی ثابت ہو سکتی ہیں لیکن تاریخ میں بیماریوں کے بڑے طویل مدتی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ خاندانوں کے زوال سے نوآبادیاتی نظام میں اضافے اور یہاں تک کہ آب و ہوا میں بھی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔

1350ء میں یورپ میں پھیلنے والے طاعون کا پیمانہ خوفناک تھا۔ جس نے آبادی کے تقریباً ایک تہائی حصے کو ختم کر دیا تھا۔ اُس دور میں طاعون سے مرنے والوں کی بڑی تعداد کا تعلق کسان طبقے سے تھا۔ اسی طرح امریکہ کی 15ویں صدی کے آخر میں نوآبادیاتی نظام متعارف کروانے والے علمبرداروں کی جانب سے ہوئیں۔ اُس وقت سب سے بڑا قاتل چیچک تھا۔ دیگر مہلک بیماریوں میں خسرہ، انفلوئنزا، طاعون، ملیریا اور ٹائیفائیڈ و دیگر شامل تھیں۔ اُس وقت بھی انسانی مصائب کی وجہ سے پوری دنیا کو نتائج بھگتنا پڑے تھے۔ 1641ء میں بھی ایک وبا شمالی چین میں پہنچی جس سے کچھ علاقوں میں بیس سے چالیس فیصد تک آبادی ہلاک ہو گئی تھی۔ تب ٹڈی دل اور طاعون کا سامنا بھی تھا۔ فصلیں تباہ ہو گئیں اور لوگوں نے وبا سے مرنے والوں کو کھانا شروع کر دیا۔ کرونا بھی چین سے آغاز ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام ممالک میں پھیل گیا۔ صدر ٹرمپ نے واضح الفاظ میں چین کو تنبیہ کر دی ہے کہ اگر یہ وائرس اُس کی کسی سازش کا نتیجہ ہے تو چین کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس عجیب و غریب وبا پر عقل حیران ہے۔ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا واقعی یہ ایک Big Game ہے؟ آج سے پندرہ سال پہلے صدر بش نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ امریکہ میں کورونا نام کا ایک وائرس پھیلے گا اور لاکھوں لوگ اس سے متاثر ہوں گے۔ آخر صدر بش کو یہ کیسے معلوم تھا۔ اسی طرح ایک انگلش مووی اسی موضوع پر ہے اور من و عن تمام واقعات اور بیماری کی شروعات اور اس کے نتائج کے بارے میں اتنا واضح دکھایا گیا جتنا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ کیا واقعی یہ چھوٹی تباہی ہے اور اس کے بعد ایک بڑی تباہی ہماری منتظر ہے؟ کہا جا رہا ہے کہ اس وائرس کے ذریعے تمام دنیا میں اس کی ویکسین لگوانا لازمی قرار دیا جائے گا۔ آپ بغیر ویکسین کے نہ ہوائی سفر کر سکیں گے نہ اس کے بغیر نکاح ہی ہو سکے گا۔ بچوں کے سکول میں داخلہ کے لیے بھی ضروری ہو گا۔ اس کام میں چند سال لگیں گے اور آخر ہر شخص کی رگوں میں یہ ویکسین دوڑ رہی ہو گی۔ یوں سمجھیں کہ ایک سرکاری وائرس دوڑ رہا ہو گا۔ جسے کبھی بھی کسی بھی طرح سے متحرک کیا جا سکے گا۔ کبھی بھی کہیں بھی کوئی وبا پھیلائی جا سکے گی۔ یعنی ایسی جنگ اور ایسا حملہ ہو گا جس میں نہ املاک تباہ ہوں گی اور نہ ہی ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یعنی Covid-19 کا مقصد اس ویکسین کے لیے آپ کو تیار کرنا ہے۔ اس سازش کے پیچھے کون ہے اور اس کے کیا مقاصد ہیں؟ اس کہانی میں کتنی سچائی ہے واللہ عالم بالصواب۔ ہمیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنی ہیں اور اللہ سے دعا کرنی ہے کہ وہ اس مشکل وقت کو جلد ختم کر دے۔ آمین

کورونا...... ہو گئے گھر میں مقید یار بھی اغیار بھی

لُٹ گئی ہیں محفلیں سب، چھن گئے تہوار بھی
ہو گئے گھر میں مقید، یار بھی اغیار بھی
ایسی خاموشی کہ جیسے شہر ساکت ہو گئے
بے صدا ہیں کوچے گلیاں بے صدا بازار بھی
ایسی دہشت، پیرہن میں ہیں مسیحا معتکف
ایسی وحشت منہ چھپائے پھرتے ہیں بیمار بھی
ایسی تنہائی کہ منظر بھی اکیلے پڑ گئے
ایسا سناٹا کہ گھبرا جائے ہے دیوار بھی
ساز کی لے اور بھی کچھ تیز کر دے درد کو
کیا بڑھائیں حوصلہ افسردہ موسیقار بھی
ساحلی گیتوں کو گانے والا اب کوئی نہیں
کشتی بھی اوندھی پڑی ہے اوندھے ہیں پتوار بھی
کھیل کے میدان خالی، بند ہیں مکتب تمام
اب تو بچوں پر ترس بھی آتا ہے اور پیار بھی
آج وہ دلکش سی جگہیں کتنی ویراں ہو گئیں
کل جہاں ہوتے تھے کتنے قول بھی اقرار بھی
کاش ایسا ہو کہ خالی جام پھر بھرنے لگیں
نذرِ مئے خانہ ہوں پھر سے ساقی بھی مئے خوار بھی
پھر گلے سے لگ کے روئیں پھر گلے لگ کر ہنسیں
پھر وہی بے ساختہ پن ہو وہی اظہار بھی
پھر مقفل آہنی در گلستانوں کے کھلیں
پھر سے اہلِ دل نظر آئیں وہاں دلدار بھی
کیسی مایوسی کہ جب اُمید ہے باقی حسن
شام کے اندر نہاں ہیں صبح کے آثار بھی

حسن عباسی/لاہور

بہت لازم ہے اب اک دوسرے سے فاصلہ رکھنا
وبا میں دوسروں سے خود کو اچھا ہے جدا رکھنا
خود اپنی ذات کا بھی قرب ہونا چاہیے حاصل
خدا نے موقع بخشا ہے تو خود سے رابطہ رکھنا
کسی کی ذات پر تنقید کرنا ہو اگر مقصود
تو اپنے سامنے پہلے ہمیشہ آئنہ رکھنا
اکٹھی ہو نہیں سکتی طلب دنیا کی جنت کی
بدن کی لذتوں کو روح سے یارو جدا رکھنا
ترا مفلس پڑوسی بھوک سے سوئے نہ ایسا ہو
غریبوں کے لیے اپنا ہمیشہ دل بڑا رکھنا
خدا کا گھر نہیں خالی خدا تو تیرے دل میں ہے
تعلق اپنے رب سے تو بنا رکھنا سدا رکھنا
کرونا کی بلا اک دن یہ ٹل ہی جائے گی آسی
دُعاؤں کا ہمیشہ اپنے رب سے سلسلہ رکھنا

عدیل آسی/ڈنمارک

خدا بھی ہے دکھایا ہے کرونا نے
کہ انساں کو بتایا ہے کرونا نے
پرانا نقشہ دُنیا کا نہیں چلنا
نیا نقشہ بنایا ہے کرونا نے
بہت مغرور تھے جو سر زمانے میں
انہیں پھر سے جھکایا ہے کرونا نے
خدا اپنا کرم رکھے کہ ابدی نیند
ہزاروں کو سلایا ہے کرونا نے
تمہیں انکھیلیاں سوجھی ہے انساں کو
بہت اندر سے کھایا ہے کرونا نے
اگر سننے کی طاقت ہم میں عابد ہو
پیامِ رب سنایا ہے کرونا نے
یہ دنیا والے تو سوتے تھے غفلت میں
انہیں سچ میں جگایا ہے کرونا نے

عابد علی خان/اٹک

بہار کے دنوں میں اُجاڑ موسم

اب کے کیسی بہار آئی ہے
جھاڑیاں بن گئے ہیں پھول بھی
اور مہک بھی نہیں ہے پھولوں میں
اِک اُداسی ہے سارے چہروں پر
کس طرح کا آ گیا موسم
اب کے کیسی بہار آئی ہے
کچھ چہک بھی نہیں پرندوں کی
اور سنسان سارے رستے ہیں
شہر خاموش ہو گئے جیسے اتنے تنہا تو ہم کبھی نہ تھے
اک اُداسی ہی گیت گاتی ہے
ایسے قصے تو پہلے سنتے تھے
شہر کے شہریوں ہی مٹتے تھے
اُنہی قصوں کی ایک سرگوشی
آج بھی تو سنائی دیتی ہے
زرد بادل بھی چھٹ ہی جائیں گے
جو دریچوں پہ یہ رکھے ہیں چراغ
ایک دن پھر سے جل ہی جائیں گے
وہی موسم پلٹ کے آئیں گے
میرے اللہ رحم کر ہم پر
ہر خوشی پھر سے لوٹ کر آئے
زندگی پھر سے لوٹ کر آئے

شہناز نقوی/میاں چنوں

نامہ ہائے احباب

محترم و مکرم حسن عباسی صاحب! مدیر "ارژنگ" لاہور

اسلام علیکم۔ اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا اور آپ کی علمی و ادبی سرگرمیاں جاری و ساری ہوں گی۔ آپ کی خدمت میں تازہ کلام حاضر ہے۔ براہِ کرم اسے بھی حسب سابق اپنے رسالے میں شائع کر کے سرفراز کریں۔

آپ کا تہہ دل سے ممنون و شکر گزار ہوں گا۔ خداوند تعالیٰ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ اسی طرح علمی و ادبی خدمات جاری رکھیں۔

آپ کا مخلص

ڈاکٹر قاسم جلال، بہاولپور

محترم حسن عباسی جی، عامر بن علی صاحب

اسلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

"ارژنگ" ملا یاد آوری کا شکریہ۔ "ارژنگ" کی مسلسل اشاعت سے اہلِ علم و ادب سے رابطہ جڑا ہوا ہے اور ادب تخلیق کرنے اور پڑھنے کی تحریک ملتی رہتی ہے۔ ورنہ سوشل میڈیا نے تو ادبی محفلیں اور رونقیں اُجاڑ دی ہیں۔ شاعروں، ادیبوں کا اکٹھا بیٹھنا ادبی آکسیجن کے حصول کے مترادف تھا۔ پریشان کن صورتِ حال یہ ہے کہ ادب میں شامل ہونے والی ہماری نسلِ نو کا کیا بنے گا۔ اس کو سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

آپ احباب کی صحت و تندرستی کے لیے دُعا گو ہوں۔

والسلام

غزالی، گوجرہ

جناب حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ "ارژنگ" موصول ہوگیا ہے بے حد شکریہ۔ اچھا بھولنے کی ہماری نے بہت خراب کر رکھا ہے۔ سوچتی رہتی ہوں کہ شاید خط لکھا تھا، پھر بھول جاتی ہوں۔ خیر یہ بعد کی بات ہے۔

حسب سابق رسالہ بہت شاندار تحریروں سے مزین ہے۔ افسانے، مضامین، شاعری، تبصرے ماشاءاللہ بہت ہی عمدہ تحریروں کا انتخاب ہے۔ یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ لکھاری ایک ہی تحریر کتنے رسالوں میں بھیج دیتے ہیں۔ ایک (مائکروفکشن) افسانہ پڑھا۔ وہ بیاض میں بھی اسی مہینے چھپا اور کہیں اور بھی۔ خیر ایڈیٹر کی رائے سب سے بہتر۔ سلام رہیں

آسناتھ کنول

لاہور

محترم جناب عامر بن علی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

ماہنامہ ارژنگ مارچ 2020ء اپنے روایتی حُسن کے ساتھ موصول ہوا۔ تمام تخلیقات قابل تحسین ہیں۔ ان میں یقیناً آپ کی کاوشوں کا عمل دخل ہے۔ غزل اور نظم شامل کرنے کا شکریہ۔

احمد جلیل

اوکاڑہ

محترم جناب عامر بن علی!

تسلیمات۔ ارژنگ مارچ آج کل زیرِ مطالعہ ہے۔ چند برس قبل شاعری ارژنگ کی پہچان تھی۔ اتنا کلام شائع ہوتا کہ پڑھ کر طبیعت سرشار ہو جاتی۔ اُس کی شاید ایک وجہ حسن عباسی اور آپ کا شاعر ہونا ہے مگر کچھ عرصہ سے نثر کو زیادہ صفحات دیے جا رہے ہیں اور شاعری کے حوالے سے تشنگی سی رہتی ہے۔ اگر اس طرف توجہ دی جائے تو خاک سار کا ذوقِ شعر تسکین پا تا رہے گا۔ آپ کے لیے ڈھیروں دُعائیں۔

آفتاب

حاصل پور

محترم جناب عامر بن علی! جناب حسن عباسی!

سلام و رحمت۔ اُمید ہے آپ احباب خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے تو میں آپ دوستوں کی شفقت و مہربانی کا شکر گزار ہوں کہ مجھے "ارژنگ" جیسا معتبر ادبی جریدہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ حمد و نعت سے لے کے نامہ ہائے احباب تک اس کا مطالعہ نہایت عرق ریزی سے کرتا ہوں اس طرح میرے ادبی ذوق کو تسکین ملتی ہے اور آپ دوستوں کے لیے دل سے بے ساختہ دُعائیں نکلتی ہیں۔

خیر اندیش

آغا تنویر، کراچی

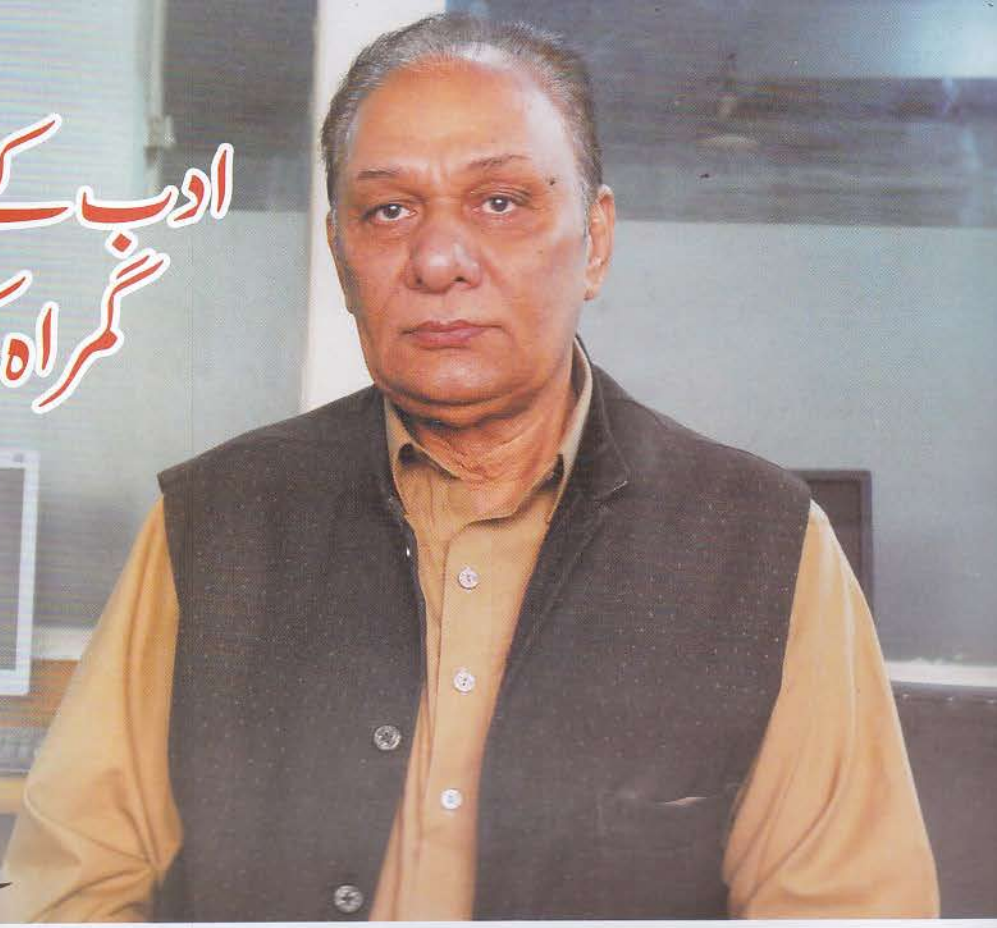

ادب کے نام پر قاری کو گمراہ کیا جا رہا ہے

نامور ادیب اور صحافی

خالد یزدانی

سے حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی گفتگو

صحافت ہماری قومی اور سیاسی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے

ارژنگ: آپ کی پیدائش کب کہاں اور کس خاندان میں ہوئی؟

خالد یزدانی: میری پیدائش ماڈل ٹاؤن لاہور میں 20 مارچ 1954ء کو ہوئی، میرے والد سید عبدالرشید یزدانی جالندھری کا شمار برصغیر پاک و ہند کے استاد شعرا میں ہوتا ہے' ان کی ساری زندگی ادب و صحافت میں ہی گزری، قیام پاکستان سے قبل وہ بمبے کی فلمی دنیا سے وابستہ بھی رہے جہاں انہوں نے متعدد فلموں کے لئے گیت اور مکالمے بھی لکھے، ان دنوں اداکار علاوالدین اور طالش بھی ان کے حلقہ احباب میں تھے، جبکہ دہلی میں اس وقت کے معروف ادبی جریدے بیسویں صدی جس کے مالک و مدیر خوشتر گرامی تھے کے ساتھ ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے، قیام پاکستان کے بعد وہ کچھ عرصہ کراچی میں مقیم رہے، صہبا لکھنوی کے ماہ نامہ ''افکار'' سے منسلک رہے، اسی دوران فلم ''بارہ بجے، غریب، اور مسکہ پالش کے گانے لکھے اسی طرح ہدائت کار روپ کے شوری کی فلم ''مس 56'' کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر بھی رہے جن دنوں میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا ہم لانڈھی میں مقیم تھے ایک روز بعد میرا رزلٹ آنا تھا، جب کراچی کو خیر باد کہہ کر والد بسلسلہ روزگار لاہور آگئے' ان دنوں مغربی پاکستان کی آپریٹو یونین نے پندرہ روزہ نیا راستہ کا اجرا کیا، جس کے چیف ایڈیٹر صادق حسین قریشی اور ایڈیٹر شرقی بن شائق اور اسسٹنٹ ایڈیٹر یزدانی جالندھری تھے۔ اسی دوران وہ روزنامہ ''سیاست' اور ماہنامہ ''محفل'' لاہور سے وابستہ ہوئے جب 22 مارچ 1990ء کو ان کا انتقال ہوا 23 مارچ کو ان کی میانی صاحب قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کے آخری روز و شب ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' کی مجلس

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

ادبی وسماجی تنظیم ''وجدان'' کے زیراہتمام

نیرنگ گیلری لاہور میں عامر بن علی کے اعزاز میں شعری نشست

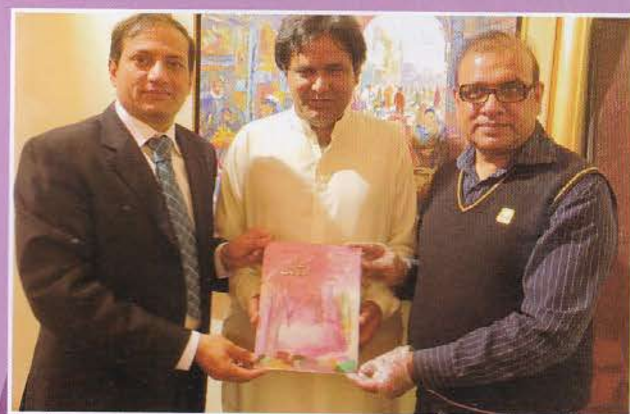

حسن عباسی، نبیل نجم، جابر حسین اور پروفیسر آصف سمیت اہم شعراء نے اپنا کلام پیش کیا

رخشندہ نوید کا DHA میں اہلِ قلم کے اعزاز میں ناشتے کا اہتمام

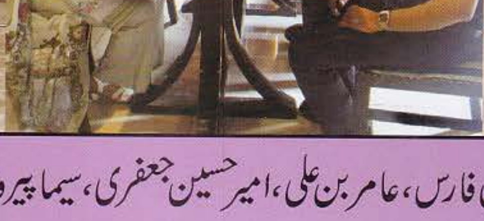

خالد شریف، رحمان فارس، عامر بن علی، امیر حسین جعفری، سیما پیروز و دیگر شریکِ محفل ہوئے